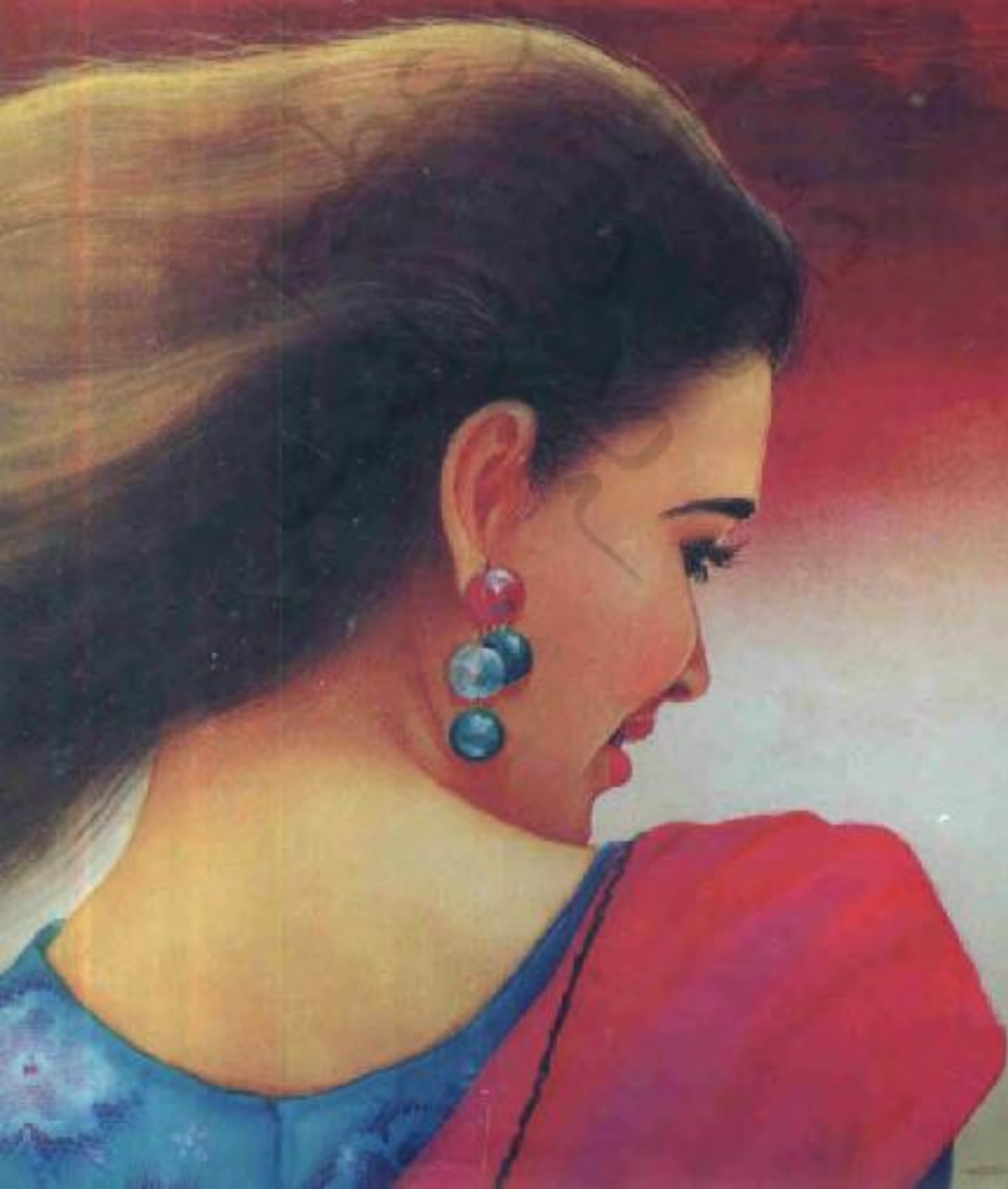


میں (محببت اور)

سُبَّاسِ گُل



جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

افتساب!

پیارے ابو جان
اور
پیری امی جان
کی بے لوث و بے ریا
محبتوں اور دعاؤں
کے
نام!

نام کتاب	میں، محبت اور تم
مصنفہ	سباس گل
ناشر	گل فراز احمد
مطبع	علم و عرفان پبلشرز، لاہور
کمپوزنگ	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
سن اشاعت	انیس احمد
قیمت	جون 2008ء
	=/200 روپے

☆..... ملنے کے پتے.....☆

علم و عرفان پبلشرز

40۔ اردو بازار، الحمد مارکیٹ، لاہور
فون: 7232336-7352332

سیونٹھ سکائی پبلیکیشنز

غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ 40۔ اردو بازار لاہور
فون: 7223584 موبائل: 0300-4125230

”محبت کے خالص رنگوں کی تخلیق کار سُبَّاس گل“

سُبَّاس گل کا شمار ہمارے معاشرے میں محبت کے حقیقی رنگوں کو زیرِ قلم لا کر، زندگی کی تلخ حقیقتوں کی نقاب کشائی نہایت عمدگی سے کرنے والی چند ادبی شخصیات میں ہوتا ہے۔

سُبَّاس محبت کو اس کائنات کا سب سے بڑا وہ طاقت ور ہتھیار مانتی ہے جس کو دوسرے میں لے کر معاشرے کے بڑے سے بڑے مسئلے کو بہت آسانی سے حل کیا جاسکتا ہے۔

عام سے گھرانے میں جنم لینے والی یہ قلم کارہ اس لحاظ سے خاصی بد قسمت ثابت ہوئی ہے کہ اس کے موتیوں بڑے الفاظ ملک کے ممتاز پرچوں میں وہ جگہ نہیں پاسکے جو اس کا حق ہے مگر اس کے باوجود سُبَّاس اپنے گداز الفاظ کے جادو سے اپنے ہزاروں قارئین کے دلوں پر بڑے طعراق سے راج کرتی دکھائی دیتی ہے۔

سُبَّاس کی روشن اور خوش رنگ تحریروں میں چھلکتے محبت کے رومانوی رنگ قاری کو بے ساختہ اپنے سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔ میری ذاتی خواہش اور دعویٰ ہے کہ اگر سُبَّاس کو آگے بڑھنے کیلئے حوصلہ افزائی کا پلیٹ فارم مہیا کیا جائے تو یہ محبت کی دیوی بہت جلد نامور لکھاریوں میں اپنا مقام بنا کر بڑے بڑے ڈائجسٹوں کی پہچان کا باعث بن سکتی ہے۔

”میں، محبت اور تم“ بھی اس کا ایک نہایت خوبصورت اور دل کو موہ لینے والا ناول ہے جو اپنی ہر ہر سطر میں آپ کیلئے دلچسپی کا نیا انداز اپنائے ہوئے ہے۔

میری تمام تر محبتیں، کوششیں اور دعائیں ہمیشہ سُبَّاس کی کامیابیوں میں اس کے ساتھ رہی ہیں اور تادمِ زیست رہیں گی! اور مجھے یہ فخر بھی ہمیشہ حاصل رہے گا کہ اس سادہ دل پیاری لڑکی کو اس خاکسار نے کتابی دنیا میں پہچان بنانے کیلئے علم و عرفان و پلشرز سے متعارف کروایا اور سُبَّاس

اس لحاظ سے بھی خوش قسمت ہے کہ اس کا پہلا ناول ملک کا ممتاز اور مایہ ناز ادارہ ”علم و عرفان پبلشر“ شائع کرنے کا اہتمام کر رہا ہے، انشاء اللہ یہ سفر جاری رہا تو ضرور ہزاروں کامیابیاں مستقبل قریب میں سہاس کے قدم چومیں گی۔

آخر میں خلوص دل سے اللہ رب العزت کے حضور دعا گو ہوں کہ وہ سہاس کو بہت جلد محبتوں اور کامرانوں کے اُس مقام تک پہنچا دے جو اس محنتی، جفاکش اور بہادر لڑکی کا حق ہے۔
(آمین)

(محبت اندر دُعا میں)

محبت، آرزوئیں، خواہشات اور خواب

بے ترتیب زندگی کے کئی رنگ ہوتے ہیں۔ صبح کا رنگ، بجلائی ہوئی شام میں ڈھلتا ہے پھر یہ شام اُجالوں میں بدل جاتی ہے۔ اس طرح روز و شب میں وقوع پذیر ہوتے حالات کا رنگ بھی بدلتا رہتا ہے، جو کبھی شوخ اور کبھی مدہم پڑ جاتا ہے۔ تخلیق کار اس زندگی سے رنگ سمیٹ کر قرطاس پر قلم سے بکھیر دیتا ہے، اور پھر ایک نئی تصویر ابھر آتی ہے۔ سہاس گل بھی ایسی ہی تخلیق کار ہے۔ جس کے جہان زندگی کے کئی روپ ہیں۔ وہ معاشرے کے بیشتر پہلوؤں کو بڑی خوبصورتی سے رقم کرتی ہیں۔ اس کی تحریروں میں محبت، آرزوئیں، خواہشات اور خواب بڑے خوبصورت انداز میں جنم لیتے ہیں۔ وہ ماحول کی عکاسی بڑی خوبصورتی سے کرتی ہیں، کہ سانس لیتے کردار حقیقی زندگی سے ربط جوڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔

زیر نظر ”تم ایسی شرارت مت کرنا“ میں یہ خصوصیات نمایاں نظر آتی ہیں۔

(فوزیہ شفیق)

مدیرہ خصوصی، ماہنامہ حنا، لاہور

میں محبت اور تم

اپنا تو چاہوں میں بھی اک اصول ہے
جب تو قبول ہے تو تیرا سب قبول ہے
یہ عمر بھر کا جاگنا بے کار ہی نہ جائے
گر تو نہیں ملی تو ریاضت فضول ہے
”بیگم! آج پھر یہاں آئی تھیں؟“ ریاض الحق نے گھر میں داخل ہوتے ہی بیوی سے پوچھ کر پوچھ شروع کر دی۔

”جی آئی تھیں..... انہوں نے تو ہماری دلیر ہی پکڑ لی ہے۔“ سلٹی بیگم نے کہا۔
”آخر وہ چاہتی کیا ہیں؟“

”اپنے بیٹے انیس احمد کے لئے ہماری بیٹی کا رشتہ چاہتی ہیں۔“
”میں نے پہلی ملاقات میں ہی اس عورت پر واضح کر دیا تھا کہ بٹا کی منگنی میں نے اپنے بھتیجے خرم سے کر دی ہے اور آئندہ چند ہفتوں میں ان دونوں کی شادی ہو جائے گی۔ پھر یہ عورت دست سوال دراز کئے یہاں چلی آتی ہے۔ تم اسے دو ٹوک الفاظ میں جواب کیوں نہیں دیتیں؟“
ریاض الحق نے قدرے برہمی سے کہا۔

”میں تو بیگم! کو سمجھا سمجھا کر جھک گئی ہوں مگر ان کی ایک ہی رٹ ہے کہ میرے انیس کی دلہن تو بٹا ہی بنے گی۔ ان کا کہنا ہے کہ بٹا کی منگنی ہی تو ہوئی ہے کون سا نکاح ہوا ہے جو توڑا نہ جاسکے۔“ سلٹی بیگم نے تفصیل سنجیدگی سے بتائی۔

”دماغ خراب ہے اس کا عورت۔ آئندہ وہ مجھے یہاں نظر نہ آئے ورنہ میں اس کی

دولت اور امارت کا رعب مٹی میں ملا دوں گا۔" ریاض الحق نے غصے سے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔

"ریاض! آپ غصے میں آنے کی بجائے ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیں تو آپ کو اپنی شنا کے لئے یہ رشتہ خدا کا انعام دکھائی دے گا۔ انیس کو آپ نے دیکھا بھی ہے۔ ماشاء اللہ چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے اور خرم سے کہیں زیادہ تعلیم یافتہ اور معاشی طور پر اس سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ خرم بیس ہزار ماہوار کمارہا ہے اور انیس ایک کامیاب بزنس مین ہے۔ ہر ماہ بیس تیس لاکھ اس کی جیب میں آتے ہیں۔ آپ ذرا غور کریں تو تین بار تو بیگم نصیر آکر سوال کر گئی ہیں۔ میں نے ان سے کہا بھی کہ شاکی تو منگنی ہو چکی ہے۔ آپ دعا کو اپنی بہو بنالیں مگر وہ تو شا کے لئے ضد کرتی رہیں۔ اتنے اونچے امیر اور معزز گھرانے میں ہماری بیٹی بیاہی جائے گی تو ہماری ہی ناک اونچی ہوگی نا۔ آپ تو خواہ مخواہ کی ضد کر رہے ہیں۔" سلسلی بیگم نے سنجیدگی مگر نرمی سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"خواہ مخواہ کی ضد تم چاہتی ہو کہ میں شنا کو انیس سے بیاہ دوں اور اپنے بھائی بھادج سے بگاڑ لوں۔ ان سے رشتہ توڑ لوں۔ سلسلی بیگم اگر شا کی منگنی میرے بھتیجے کی بجائے تمہارے بھتیجے سے ملے ہوئی ہوتی تب میں دیکھتا کہ تم کیسے یہ بات کرتی ہو؟" وہ غصے سے بولے۔

"ریاض! میں شا کی ماں ہوں۔ اپنی بیٹی کا بھلا ہی چاہتی ہوں۔ اگر میرا بھتیجہ شنا کا منگیتر ہوتا تو میں اس رشتے کو قبول کر کے شا کی اس سے منگنی توڑ دیتی اور اگر میرے بھائی کے گھر والے دعا کے لئے مان جاتے تو میں بھتیجے سے ندا کو بیاہ دیتی۔ اولاد کی بھلائی اور اس کے بہتر مستقبل کے ارے میں سوچنا والدین کا فرض ہوتا ہے۔ اس لئے سچی بات ہے مجھے تو انیس کا رشتہ دل سے قبول ہے اگر آپ اپنی ضد چھوڑ دیں تو....."

"بس..... میرا یہ آخری فیصلہ ہے۔ اس گھر میں وہی ہوگا جو میں چاہوں گا اور ویسے بھی دوسرا ال ہو چکے ہیں شنا اور خرم کی منگنی کو اور اتنے عرصے میں دونوں کے ذہنوں اور دلوں میں ایک دوسرے کے لئے محبت اور پسندیدگی کے جذبات پیدا ہو چکے ہوں گے۔ ان کے خوابوں کو چکنا چور کر کے کون سا سکھ پاسکوگی تم۔ اب اگر وہ عودت یہاں آئے تو اسے صاف صاف کہہ دینا کہ دوبارہ یہاں کا رخ نہ کرے میں آج ہی نرمس کو فون کر کے بلواتا ہوں اور شنا اور خرم کی شادی کی تاریخ طے کر کے ہی دم لوں گا۔ مذاق بنا رکھا ہے تم لوگوں نے رشتوں کو۔" ریاض الحق نے غصیلے اور درشت ہجے میں کہتے ہوئے اپنے کمرے کا رخ کیا تو سلسلی بیگم تاسف سے آہ بھر کر رہ گئیں۔

"کاش! انیس کا رشتہ دو سال پہلے آگیا ہوتا۔" سلسلی بیگم نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا تو جو ماں باپ کی ساری گفتگو اپنے کمرے کے دروازے سے کان لگائے کھڑی سن چکی تھی گہری

سانس لے کر کرسی پہ ڈھے گئی۔

"انیس احمد بندہ تو بہت ڈشنگ ہے لیکن میری آنکھوں نے خرم کے خواب سجا رکھے ہیں۔ شکر ہے ابو نے میرے خواب ٹوٹنے سے بچا لئے اور خرم وہ تو کہتا ہے کہ شنا تمہاری جدائی کا تصور ہی میری روح کھینچنے لگتا ہے۔ تم تو میری سانسوں میں بسی ہو۔ تم ہو تو یہ سانس کا سفر جاری ہے تمہارے بغیر تو میری سانس بھی رُک رُک جاتی ہے۔"

خرم کا جذبوں کی شدت سے پُر لہجہ اس کی سماعتوں میں گونجا تو وہ ہنس پڑی۔

"پگلا کہیں کا۔"

"کہیں کا نہیں پگلا یہاں کا بلکہ پگلا تمہیں کا۔"

اسی وقت خرم اس کے کمرے میں داخل ہوا اور اس کی بات سن کر شرارت سے بولا۔

"تو بہ تم تو پورے شیطان ہو۔ ابھی یاد کیا ابھی حاضر۔"

"شیطان کی بجائے اگر میری جان کہہ دیتیں تو تمہارے جذبوں کی شدت میں کی آ جاتی کیا؟" وہ مصنوعی خشکی سے بولا۔ اونچا لمبا بھرا جسم براؤن آنکھیں اور گندی رنگت والا خرم شبیر

اس کی آنکھوں میں سارہا تھا۔

"نہیں لیکن ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے۔" وہ شرمیلے پن سے مسکراتے ہوئے بولی تو

شوخی و شریر لہجے میں گویا ہوا۔

"چلو وقت بھی جلد آنے والا ہے۔ ہم تھوڑا سا جبر اور کیے لیتے ہیں۔ پھر تو ہم تم ہوں

گے، بادل ہوگا، رقص میں سارا جنگل ہوگا ہم تم....."

"اچھا اب منہ بند کرو اور جاؤ یہاں سے مجھے ہچیر کی تیاری کرنے دو۔" وہ ہنس کر کتاب

اٹھاتے ہوئے بولی۔

"لڑکیاں تو یہ سب سننے کے لئے ترستی ہیں ایک تم ہو۔"

"جو لڑکیاں یہ سننے کے لئے ترستی ہیں نا، تم جا کر انہیں سناؤ۔ مجھے کوئی شوق نہیں یہ سب

سننے کا۔" وہ تنک کر بولی۔

"اچھا جی! ٹھیک ہے جا رہا ہوں پھر نہ کہنا کہ کیوں کسی ذات کے تم اسیر ہوئے۔" وہ

شوخی سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میری بلا سے ہو جاؤ۔ تمہاری محبت کی حقیقت بھی کھل جائے گی مجھ پر۔"

"پھر تم کیا کرو گی؟"

”میرے لئے رشتوں کی کمی تھوڑی ہے، تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی۔ ایک چھوڑوں تو ہزار مل جائیں گے مجھے، تم اپنی خیر مناد۔“ وہ بھی اتراتے ہوئے شوخ و شریل لہجے میں بولی تو وہ ہنس پڑا۔

”ٹٹا مذاق کی حد تک تو مجھے یہ بات گوارہ ہے مگر درحقیقت میں تمہیں اپنے سوا کسی اور کا ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکوں گا۔ تمہیں تو یقیناً ہزار رشتے مل جائیں گے لیکن مجھے پھر تمہارے جیسی کوئی دوسری نہیں ملے گی۔ تم نہیں تو جینا نہیں۔ تم میری ہو صرف میری، زعنگی کے ہر خشیب و فرار میں تم مجھے اپنے ساتھ پاؤ گی۔ میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں رہے گا۔ میری زعنگی کے سارے شکھ تم سے عبارت ہیں ٹٹا۔“ وہ اس کے ہاتھ تمام کر اُسے دالہانہ پن سے دیکھتے ہوئے بولا تو وہ حیا سے گلہار ہو گئی۔ دل خوشی سے جھومنے لگا۔

”چلو دیکھیں گے شادی سے پہلے سب مرد اسی طرح محبت کے دعوے کرتے ہیں بعد میں ساری محبت جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔“ ٹٹا نے مسکراتے ہوئے اسے چڑانے کے لئے کہا۔

”یہ دعوے نہیں ہیں ٹٹا اب یا تب جب چاہے میری محبت کو مجھے تم آزما سکتی ہو۔ میں ہر امتحان میں پورا اتروں گا۔“ وہ ہل کر بولا۔

”ایک اور دعویٰ۔“

”ٹٹا کی بیٹی۔۔۔ میں جا رہا ہوں بس۔“ وہ خفگی سے بولا۔

”پھر کب آؤ گے؟“ اس کی زبان پھسل گئی، اور وہ خوشدلی سے ہنس پڑا۔

☆☆☆

نقیس احمد اور آسیہ نقیس احمد کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے جلیس احمد اور ان سے چار سال چھوٹا انیس احمد۔ جلیس احمد شادی شدہ تھے اور اپنی بیوی ماری اور بیٹیوں اقراء، اسرٹی اور بیٹی دانیال احمد کے ساتھ لندن میں مقیم تھے۔ وہ وہاں کا بزنس دیکھ رہے تھے۔ نقیس احمد بہت بڑے تاجر اور صنعت کار تھے۔ اپنے مال کی زکوٰۃ ضرور ادا کرتے تھے۔ غریبوں کی امداد بھی کرتے تھے۔ اسی لئے ان کے کاروبار کو بہت ترقی مل رہی تھی۔ انیس احمد نے ایم سی ایس، ایم بی اے اور فیشن ڈیزائننگ میں ماسٹرز کیا تھا اور اس کے بعد نقیس احمد کی خواہش پر ان کا بزنس سنبھال لیا تھا حالانکہ اسے اس کی تعلیمی قابلیت کی بدولت بہت اچھی جائز مل رہی تھیں لیکن اس نے والد کی خواہش پر ذاتی بزنس میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کو ترجیح دی اور ایک سال کے اندر اندر اس نے کئی کامیابیاں حاصل کیں۔ گارمنٹس کی مصنوعات، فوڈ پروڈکٹس اور گھریلو مصنوعات کے شعبوں میں ”نقیس گروپ آف انڈسٹریز“ کو بہت بڑے آرڈر ملے تھے۔

ٹٹا کو انیس نے اپنے ایک فیملی فرینڈ ٹار مرزا جو کہ نقیس احمد کے بہت قریبی اور پڑا نے دوست تھے، ان کے بیٹے کی دعوت ولیمہ کی تقریب میں دیکھا تھا۔ ٹار مرزا ابھی محکمہ انکم ٹیکس سے ریٹائر ہوئے تھے اور ان کا بیٹا عمار مرزا اب اس محکمے میں ملازم تھا، اور نقیس احمد کو ان سے اکثر کام پڑتا رہتا تھا لہذا تعلقات بدستور خوشگوار بنیادوں پر استوار تھے۔ اسی لئے نقیس احمد، آسیہ بیگم اور انیس احمد عمار مرزا کی شادی کی تقریب میں شریک تھے۔ عمار، اسرار الحق کے کولیگ تھے اور بہت اچھے دوست بن چکے تھے اس لئے اسرار الحق کو عمار نے اپنی شادی میں مع اہل خانہ کے دعوت دی تھی۔ سائرہ کی طبیعت خراب تھی۔ سلمیٰ بیگم اور ٹٹا کو اسرار الحق کے ساتھ عمار کی دعوت ولیمہ میں جانا پڑا۔ آسیہ نقیس کی نظر ٹٹا پر پڑی تو وہ اس کی جانب کبھی چلی آئیں۔ سلور کلر کا چوری دار ہاجامہ اس پر پنک رنگ کی خوبصورت پشتواز زیب تن کئے ہوئے تھی۔ سیاہ ہلکے ریٹھی بالوں کو بہت اسٹائل دے کر کھلا رہنے دیا تھا۔ ٹٹا ہلکے میک اپ اور ہلکی سی جیولری میں انیس جنت کی حور دکھائی دے رہی تھی۔ ان کے دل میں یکا یک اُسے اپنی بہو بنالینے کا خیال آیا تھا۔ انیس احمد چھ فٹ دو انچ قد کا مالک تھا۔ کسرتی بدن، سرخ و سفید رنگت، بڑی بڑی روشن آنکھیں چہرے کے دلکش خدوخال میں احمر لبوں پر مسکراہٹ تھی ہوتی تو وہ اور بھی دلنشین لگنے لگتا تھا۔ اپنے شہزادوں کی سی آن بان والے بیٹے کے لئے انیس ٹٹا جیسی لڑکی کی ہی تلاش تھی۔

”بیٹی! کیا نام ہے آپ کا؟“ بیگم آسیہ نقیس نے ٹٹا کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا تو وہ اس گریس فل اجنبی سی خاتون کو دیکھ کر گھبرا سی گئی۔

”السلام وعلیکم! ٹٹا نام ہے میرا۔“

”وعلیکم السلام! ماشاء اللہ آپ کا نام بہت پیارا ہے اور آواز بھی بہت دلنشین ہے۔ کس کے ساتھ آئی ہیں آپ؟“

”امی اور بھائی جان کے ساتھ۔ وہ میری امی ہیں گرین سوٹ والی۔“ ٹٹا نے اسٹیج پر عمار کی دہن کے پاس بیٹھی ہوئی سلمیٰ بیگم کی جانب اشارہ کر کے جواب دیا۔

”اچھا میں اُن سے وہیں مل لیتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اس کے رخسار کو تھپتھپاتی ہوئیں اسٹیج کی جانب بڑھ گئیں۔ ٹٹا کو گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ وہ اٹھ کر لان میں لگے اس ٹینٹ سے باہر نکل آئی۔ اسرار الحق عمار کے ساتھ محو گفتگو تھا۔ وہ انیس دیکھتے ہی وہاں سے بولی۔

”اسرار بھائی! بہت دیر ہو گئی ہے اب گھر چلیں۔“

”ٹٹا بہن! آپ اس گھر کو بھی اپنا ہی گھر سمجھیں۔ بھائی کی خوشی کے لئے کچھ دیر اور رکنا

پڑے گا آپ لوگوں کو۔“ اسرار کی بجائے عمار نے اس کو دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے جواب دیا وہ بھی مسکرا دی۔

”عمار یارا! ماما کہاں ہیں میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہو رہا ہوں۔ رات کا ایک بجنے والا ہے گھر بھی جانا ہے ہمیں۔“

اسی وقت انیس احمد نے وہاں آکر ڈھائی دی۔

اسرار الحق سے تو عمار پہلے ہی اس کا تعارف کروا چکا تھا لہذا اسرار الحق کو اس کے اجنبی ہونے کا احساس نہیں ہوا بلکہ وہ ہنس کر بولے۔

”سن لو سب یار دوستوں کو گھر جانے کی جلدی ہے اب ہمیں بھی تم اجازت دے دو۔ تمہاری بڑی مہربانی۔“

”اچھا بابا! جاؤ کیا یاد کرو گے کس سخی دو لمبے سے واسطہ پڑا تھا۔“ عمار نے کہا تو وہ دونوں ہنسنے لگے۔ ہنستے ہوئے اچانک ہی انیس احمد کی نگاہ ثنا کے خوبصورت سراپے پر پڑی تو اس کی ذرا ساکت ہو گئی۔

”ثنا! جاؤ امی کو بلا لاؤ۔“ اسرار الحق نے ثنا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”میری ماما کو بھی بلا دیں پلیز۔“ انیس نے بے اختیار اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”آپ کی ماما کی انہیں کیا پہچان ہوگی۔ آپ خود ہی اندر دیکھ لیں۔ خواتین تو سب ہی جا چکی ہیں میرا خیال ہے کہ گھر کی اور کچھ قریبی رشتے دار خواتین موجود ہوں گی۔“ اسرار الحق نے مسکرا کر کہا تو ثنائیت کے بھولوں سے بچے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔ انیس احمد بھی اُس کے پیچھے ہی چلا آیا۔

سلمیٰ بیگم اور بیگم آسیہ نفیس احمد آپس میں کسی بات پر ہنس رہی تھیں۔

”امی! چلیں۔“

”چلیں ماما۔“ انیس احمد اور ثنا نے ایک ساتھ ان کے قریب پہنچ کر کہا اور ایک ساتھ ہی حیرت سے اک دو بے کودیکھا تھا اور انیس احمد پر تو اس کا دیکھنا ایک قیامت ڈھا گیا۔ اسے اپنا دل اپنے اختیار سے باہر نکلا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی من موہنی صورت نے آنکھوں کے رستے سے اس کے دل و دماغ میں اپنا عکس اتار دیا تھا۔ سلمیٰ بیگم ثنا کو لے کر چلی گئی تھیں اور وہ یوں ہی اس لمحے کے سحر میں جکڑا ساکت و صامت کھڑا تھا۔ بیگم آسیہ نفیس احمد بھی بیٹے کی آنکھوں میں ثنا کے لئے چمکتے جگنو

دیکھ چکی تھیں اور بہت مسرور تھیں اُن کی پسند اُن کے بیٹے کی پسندیدگی کی سند حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ انہوں نے انیس احمد کے بازو پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”پیاری ہے نا ثنا، تمہاری اور اس کی جوڑی خوب بچے گی۔“

”اس پنک لڑکی کا نام ثنا ہے۔“ وہ چونکتے ہوئے بولا۔

”ہاں اور میں نے اسے تمہاری دلہن بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”اچھا جیسے آپ کی مرضی۔“ وہ من کی خوشی چھپاتے ہوئے سعادت مندی سے بولا تو وہ

شوخی سے پوچھنے لگیں۔

”اور تمہاری مرضی کیا ہے؟“

”آپ بتائیں۔“ انیس احمد نے ان کے چہرے کو مسکرا کر دیکھا۔

”وہی جو میری مرضی ہے نا؟“

”جی ہاں ماما۔“ وہ ہنس پڑا۔

اور پھر عمار کے ذریعے انہوں نے ریاض الحق اور ان کے گھرانے کے متعلق ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد ان کے در پر دستک دی اور مہذب، شریفانہ روایتی طریقے سے انیس کے لئے ثنا کا رشتہ طلب کیا جو کہ ثنا کی خرم سے متغنی کی وجہ سے رد کر دیا گیا۔ جس کا بیگم آسیہ نفیس احمد سے زیادہ انیس احمد کو دکھ پہنچا تھا۔ بیگم آسیہ نفیس احمد دوبارہ بھی گئیں مگر انہیں انکار ہی سننے کو ملا تھا سو انہوں نے نصیب کا لکھا سمجھ کر صبر کر لیا مگر وہ افسردہ تھیں یہ رشتہ نہ ہو سکتے پر، انیس نے انہیں افسردہ دیکھا تو کہنے لگا۔

”کوئی بات نہیں ماما! ثنا کے علاوہ لڑکیاں اور بھی ہیں۔“

”تمہیں دکھ نہیں ہوا؟“ بیگم آسیہ نفیس نے اس کے چہرے پر غم کو کھوجنا چاہا۔

”مجھے تو عشق ہوا ہے ثنا سے۔“ وہ بے بسی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”کاش! انیس بیٹا میں ان لوگوں کو قائل کر سکتی۔“

”کوئی بات نہیں ماما جانی بس آپ میرے لئے دعا کریں کہ عشق کا یہ بھوت میرے سر

سے اتر جائے۔“ وہ افسردگی سے مسکرا کر بولا۔

”میں تمہارے لئے دعا کروں گی کہ ثنا تمہیں مل جائے اور اس کی محبت بھی تمہارا نصیب

بن جائے۔“

بیگم آسیہ نفیس احمد نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے دل سے کہا تو وہ بولا۔

ترنگ سیاہ پوش لکلا۔ اس کے چہرے پر اور ڈرائیور کے چہرے پر بھی سیاہ ماسک چڑھا ہوا تھا۔ ندا اور ثنا کی چیخیں نکل گئیں۔ اس سیاہ پوش نے ثنا کو بازو سے پکڑ کر گاڑی میں اتنی تیزی سے دھکیلا تھا کہ ثنا منہ کے بل پچھلی سیٹوں پر گری تھی۔ ندا تو چیختی ہوئی اُلٹے قدموں کالج کی جانب دوڑی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ کارفرمائے بھرتی ہوئی آگے نکل گئی تھی۔ کالج کی لڑکیوں، چوکیدار اور لڑکیوں کو لینے کے لئے آنے والے مرد حضرات نے بہت بے حسی اور بزدلی سے واردات ہوتے دیکھی تھی اور کسی نے ثنا کو ان سیاہ پوشوں سے بچانے کی سعی نہیں کی تھی۔

ندا کو کالج کی لڑکیاں پرنسپل کے پاس لے گئیں۔ پرنسپل آفس سے ندا نے اپنے ایس پی والد ریاض الحق کو فون کیا اور روتے ہوئے ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ ثنا کے دن دیہاڑے اغواء کی خبر پورے کالج سے ثنا کے محلے تک جنگ کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ ریاض الحق نے پورے علاقے کی ناکہ بندی کرا دی تھی مگر ثنا کو اغواء کرنے والے ایسے اپنی کارسمیت غائب ہو گئے تھے جیسے گدھے کے سر سے سینک۔

☆☆☆

ثنا بے ہوش تھی۔ جب اُسے ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک سادہ سے بیڈ روم میں پایا۔ کمرے میں پہلے بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے حیران و پریشان نظروں سے کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ یکا یک اس کے حواس بیدار ہو گئے اور اسے ساری صورت حال سمجھ میں آ گئی۔

”میں اغواء ہو چکی ہوں۔ یا اللہ یہ کیا ہو گیا میرے ساتھ۔“ وہ خوف و ہراس سے روتے ہوئے بولی۔ کلائی پر بندھی رسٹ وچ پر نگاہ ڈالی تو اس کی روح کانپ اٹھی۔ شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ یعنی وہ پچھلے ساڑھے چار گھنٹے سے یہاں قید تھی۔

”یا اللہ میری مدد فرما، مجھے یہاں سے جانے کا راستہ دکھا میرے مالک۔“ وہ روتے ہوئے دعا مانگ رہی تھی کہ اچانک کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور اس کی جان نکال گیا۔ وہ سہی سہی بیڈ کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔ کمرے میں وہی سیاہ پوش کھانے کے لوازمات سے بچی ٹرے لے کر داخل ہوا۔

”ہوش آگیا تمہیں۔ لو کھانا کھا لو اب تک تو تمہارے باپ کے ہوش بھی ٹھکانے آ گئے ہوں گے۔ بڑا قانون کا محافظ بنا پھرتا ہے، اب پتہ چلے گا اُسے ہمارا کام نہ کرنے اور ہماری بات نہ ماننے کا خمیازہ بھگتنے کا۔ اب سارا شہر تھو تھو کر رہا ہے کہ ایک پولیس آفیسر کی بیٹی دن کے اُجالے میں لوگوں کے ہجوم میں اغواء کر لی گئی اور وہ کچھ نہ کر سکا۔“ وہ سیاہ ماسک والا شخص بہت کراخت لہجے میں

”آمین!“

☆☆☆

خرم صبح صبح اس کے لئے سُرخ تازہ گلاب لئے حاضر ہو گیا اور مٹھول اس کی جانب بڑھایا تو وہ بلش ہو گئی۔

”آج صبح صبح محبت کا سبق پڑھانے چلے آئے ہو، خیر تو ہے۔“ وہ مٹھول لے کر بولی۔

”میں نے سوچا کہ تم صبح سویرے میری صورت دیکھ لو گی تو سارا دن اچھا گزرے گا۔“ وہ شوخی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”میرا یا تمہارا دن؟“ وہ بڑی ادا سے بولی تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

”چلو یوں ہی سہی ویسے تمہیں پتہ ہے آج مابذلت کو اپنی اس حسین و جمیل منگیتر کے لئے شادی کا تحفہ خریدنا ہے خریدنا کیا ہے آرڈر پر بنوایا ہے۔ آج مل جائے گا۔“ وہ رازداری سے بتا رہا تھا ثنا شرمانے لگی۔

”کیا بنوایا ہے؟“

”یہ سر پرانز تو شادی کی رات ہی ملے گا۔ بس ایک ماہ بعد تم میرے اتنے قریب ہو گی کہ سارے قافلے سمٹ کر رہ جائیں گے۔“

”بکومت، جاؤ یہاں سے۔“ وہ شرما کر بولی اور تیزی سے باہر بھاگی جہاں اسرار الحق اسے اور ندا کو کالج کو چھوڑنے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ خرم ہنستا مسکراتا ناشتے کی میز پر آ گیا تھا۔

ثنا کا آخری پیچہ بہت شاندار ہوا تھا۔ وہ بہت خوش تھی، آج ندا کی کلاسز آف ہو چکی تھیں۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہی کالج کے گیٹ سے باہر نکل آئی۔ کالج میں صرف تھرڈ ایئر کی چند کلاسز ہو رہی تھیں اور بی اے، بی ایس سی کے امتحانات ہو رہے تھے۔ اس وجہ سے رش بہت کم تھا۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا تھا عدا اور ثنا کو اسرار الحق اور انوار الحق کا انتظار کرتے کرتے لیکن دونوں میں سے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔

”اب کیا کریں؟ پیدل ہی چلتے ہیں مگر کون سا دور ہے۔“ ندا نے کہا۔

”ہاں چلو لوگ بھی آتے جاتے مشکوک نظروں سے دیکھ رہے ہیں کالج بھی خالی ہونے کو ہے۔“ ثنا نے کہا اور دونوں گھر کی جانب جانے والی سڑک کی طرف مڑ گئیں۔

ابھی وہ چند قدم ہی چل پائی تھیں کہ ان کے قریب ایک کار آ کر رکی وہ دونوں گھبرا کر پیچھے ہٹیں۔ ابھی وہ صورت حال کو سمجھ بھی نہیں پائی تھیں کہ کار کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک لمبا

بولا۔ "پتہ نہیں تھا کہ کیوں لگا کہ وہ شخص آواز بدل کر بول رہا ہے تاکہ وہ اس کی شناخت نہ کر سکے۔"
"کک..... کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو.....؟" مم..... مجھے کیوں اغواء کیا ہے.....؟" وہ ڈرتے ہوئے لرزتے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"تمہارے باپ سے اپنی بات منوانے کے لئے ہم نے تمہیں اغواء کیا ہے لو کھانا کھاؤ۔" وہ ٹرے میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

"پلیز! مجھے جانے دو، میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" وہ روتے ہوئے بولی۔
"تم ہمارا کیا بگاڑ سکتی ہو لڑکی، بگاڑیں گے تو ہم تمہارا..... تمہارا باپ ہمارے آدمی چھوڑ دے گا تو ہم بھی تمہیں چھوڑ دیں گے جب تک وہ ہماری بات نہیں مانتا تم یہیں رہو، کھاؤ پیو، سوؤ جاگو، موج کرو۔" وہ مکروہ انداز میں قہقہہ لگا کر بولا تو وہ اس کی باتوں سے اپنی آن، آبرو کی بربادی کا خوف محسوس کرنے لگی۔

"پلیز! مجھے جانے دو، تمہاری بھی تو بہن بیٹی ہوگی۔"
"اے خبردار! ہماری بہن بیٹی کا نام مت لو ورنہ....." وہ اسے کڑھکی سے ٹوک کر بولا اور گھورتا ہوا واپس چلا گیا اور دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔

ثنا بے دم سی ہو کر بستر پر گر گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ روتے تڑپتے کئی بار اس نے کمرے کے دروازے کو اپنے ہاتھوں سے پیٹا مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔
عشاء کی اذان بہت دور سے اس کے کانوں میں آرہی تھی۔ اس نے کمرے سے ملحق غسل خانے میں جا کر وضو کیا اور اپنی چادر اوڑھ کر نماز ادا کرنے لگی۔ کہیں دوسری چادر یا جائے نماز تو اسے میسر نہ تھی۔ نماز پڑھ کر رو کر اپنی خیر و عافیت سے، عزت سے گھر واپسی کی دعا مانگی اور پھر سے دروازہ پیٹنے لگی۔ لگتا تھا جیسے وہ کسی خاموش جزیرے میں آگئی ہے جہاں کوئی بھی اس کی آواز سننے کو تیار نہ تھا۔ سب بہرے تھے کسی کے کانوں تک اس کی آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔

"میرے اللہ! تو میری فریاد سن رہا ہے نا، رحم کر مالک! مجھے یہاں سے نکال میرے اللہ۔" وہ روتے ہوئے اپنے رب سے مخاطب تھی۔

دروازہ ہلکی سی آہٹ کے ساتھ کھل گیا اور آنے والے نقاب پوش نے دروازہ اندر سے لاک کر لیا تھا اور یہ منظر دیکھ کر ثنا سہمی ہوئی چڑیا کی طرح تھر تھراکھنے لگی۔ وہ شخص دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔

"نن..... نہیں مجھے مت مٹھو نا..... مت..... تمہیں خدا کا واسطہ ہے مجھے..... مت مٹھو نا۔"

وہ چیخ مار کر اُلٹے قدموں پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ اس کے لہجے میں آنسوؤں کی جھنکار تھی۔
"شی....." اس شخص نے شہادت کی انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھتے ہوئے اسے مزید بولنے سے باز رکھنے کا اشارہ دیا تو وہ ہچکی لیتی، روتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔ کوئی جائے فرار باقی نہیں بچی تھی۔ وہ بے بس کھڑی اپنی حالت پہ ماتم کناں تھی۔ اس سیاہ ماسک والے شخص نے میز پر رکھی کینڈل جلائی اور بلب بجھا دیا اور ثنا کی جانب پلٹا۔ وہ دیوار سے لگی اپنے بے جان ہوتے وجود کی عمارت کو سنبھالنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے ساتھ اب کیا ہونے والا ہے۔ وہ شخص بہت کھلتی خواہشوں کے تلاطم سے سرشار اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔

"نہیں پلیز! مجھے مت مٹھو نا۔" وہ فریاد کرتی بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے اس گدھ کے پروں میں پھنس کر رہ گئی۔ اس کے مضبوط پد اس کا سارا بدن ڈھانپ چکے تھے۔ اس کے آنسو سمندر میں شبنم کی مانند حل ہو گئے۔ سسکیاں، ہچکیاں، تند موجوں کی آواز میں بے صدا ہو گئیں اور وہ سہمی ہوئی چڑیا ذلت و رسوائی کے اتھاہ سمندر میں غوطے لگاتے ہوئے ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئی۔

☆☆☆

"آپ کی پولیس کیا بھنگ پی کر سو رہی ہے جواب تک میری بچی کے مجرموں کو اور میری معصوم بچی کو نہیں ڈھونڈ سکی؟" سسلی بیگم نے روتے ہوئے ریاض الحق سے کہا۔
"حوصلہ کرو سسلی بیگم! دُعا کرو پولیس کوشش کر رہی ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی کوئی اچھی خبر سننے کو ملے گی۔" ریاض الحق نے اپنی پریشانی مٹھپاتے ہوئے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا خرم اور اس کے امی ابو بھی وہاں آچکے تھے۔

"اب اچھی خبر سننے کو مل بھی جائے تو کیا فرق پڑے گا۔ خاندان بھر کی ذلت و رسوائی تو ہوگئی نا شہر بھر میں اب اخبارات میں بھی خبریں لگیں گی۔ خوب نام روشن ہوگا ہمارا۔" نرمس نے بے حسی سے کہا۔

"امی پلیز! یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔" خرم نے انہیں ٹوکا۔
"ریاض بھائی! اغواء کرنے والوں کا فون تو آیا ہوگا۔" فیاض الحق نے پوچھا۔
"نہیں ابھی تک تو کوئی فون نہیں آیا۔ نجانے کس مقصد کے لئے انہوں نے میری بیٹی کو اغواء کیا ہے؟" وہ پریشانی سے بولے۔

"کیا خبر اغواء کیا ہے یا وہ اپنی مرضی سے مکی ہے۔" نرمس کی زبان نے زہرا لگا تو سسلی بیگم بے قرار ہو کر بولیں۔

”نرگس! خدا کا خوف کرو۔ میری ثنا معصوم ہے، اُسے اغواء کیا گیا ہے۔ عدا یعنی گواہ ہے اور بہت سے لوگ گواہ ہیں۔“

”بھابی! کل کو یہی گواہ ہاتھوں میں پتھر لئے اسے سنگسار کرنے کے لئے آپ کے گھر کے دروازے پر کھڑے ہوں گے۔“ نرگس نے بے دردی سے کہا۔

”تم تو بس چپ ہی رہو نرگس۔“ فیاض الحق نے بیوی کو ڈانٹا۔
 ”میں تو چپ ہو ہی جاؤں گی لوگوں کو کون چپ کرائے گا۔ ان کی زبانیں کون پکڑے گا؟“ نرگس نے غصے سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”چلو خرم!“ اور خرم چپ چاپ ان کے ساتھ چل پڑا۔

☆☆☆

پورے سات دن گزر گئے تھے۔ آج اسے اس قید میں، اس کی حالت برسوں کی بیماری سی ہو گئی تھی۔ آٹھویں شب آئی تو اسے قید سے رہائی کا پروانہ مل گیا۔ وہ سیاہ پوش بڑی آسانی سے کھڑ رہا تھا۔

”معاف کرنا لڑکی، تم وہ نہیں ہو جسے اغواء کرنے کا ہمیں حکم ملا تھا۔ وہ تو تمہارے باپ سے بھی بڑے افسر کی بیٹی تھی۔“
 ”کیا.....؟“

”ہاں اب تم جاسکتی ہو۔“
 ”کہاں جاؤں گی اب میں.....؟“ وہ اس ذلت پر روتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔
 ”اپنے گھر.....!“

”گھر والے اب مجھے قبول کر لیں گے کیا.....؟“
 ”یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ ہمیں تو تمہیں رہا کرنے کا حکم ملا ہے۔ باہر ٹیکسی کھڑی ہے۔ میں نے ڈرائیور کو تمہارے کا گھر کا پتہ سمجھا دیا ہے اور کرایہ بھی دے دیا ہے۔ جاؤ اور ہاں چہرہ چھپا کر نکلتا۔“ وہ ہدایات دے رہا تھا۔

”اب کیا تم بڑے افسر کی بیٹی بھی اغواء کرو گے اس کی بھی عزت تار تار کرو گے؟“ وہ کسی کے دھوکے میں اپنے آپ کو سزا ملنے پر صدمے سے چور لہجے میں بولی۔

”نہیں۔ اس نے پہلے ہی ہمارے بندے چھوڑ دیئے ہیں۔ تمہارے اغواء سے بھی ہمارا کام ہو گیا ہے، اب جاؤ یہاں سے۔“ وہ کرخٹ لہجے میں بولا تو وہ اپنے وجود کی کرجیوں کو سمیٹتی ہوئی

وہاں سے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

”کون ہو تم؟“ وہ گھر کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو سائرہ بھابی اس کے نقاب میں نیچے چہرے کو پہچان نہ سکیں اور فوراً پوچھا۔
 ”میں ثنا.....“

”ثنا..... تو چہرہ کیوں چھپا رکھا ہے، دکھانے کے قابل جو نہیں رہا اس لئے نا۔“ سائرہ بھابی نے طنزیہ جملہ بولا تو اس نے چہرے سے چادر ہٹا دی۔

”کون ہے؟“ عدا، اسرار الحق، سلمیٰ بیگم اور بشری سب ایک ساتھ چلے آئے۔
 ”آگئی ہیں آپ کی بہن صاحبہ خاندان کی عزت نیلام کر کے۔“ سائرہ نے طنزیہ لہجے میں کہا تو ثنا کے زخم رسنے لگے۔

”ثنا! میری بچی کیسی ہے تو.....؟“ سلمیٰ بیگم نے دوڑ کر اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔
 ”امی! امی.....“ وہ روتے روتے بے ہوش ہو گئی۔

انہوں نے ڈاکٹر کو گھر بلایا تھا وہ ثنا کو نیند کا انجکشن لگا کر چلا گیا۔

وہ گہری نیند سو گئی تھی اور صبح ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اسے کچھ یاد آرہا تھا۔ قیامت کے سات دن اور سات راتیں اور اپنی آبرو کے خاک ہونے کی تلخ حقیقت اُسے زلزلے جارہی تھی۔ اس تصور سے ہی اس کے بدن میں چوہنیاں سی رینگنے لگتی تھیں۔ اس کی اس بات پر کسی نے یقین نہیں کیا کہ اسے کسی اور کے دھوکے میں اغواء کیا گیا تھا اور سات دن بعد اغواء کرنے والوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انہوں نے اسے چھوڑ دیا۔ ثنا اپنی صفائی دیتے دیتے تھک گئی تھی، ہار گئی تھی۔ دکھ تو اسے اس بات کا تھا کہ اس کے ماں باپ نے اسے اکیلا کر دیا تھا۔ اس کی محبت کا دم بھرنے والے خرم نے اُسے ایک فون تک نہ کیا تھا کہاں وہ اس کو دیکھنے کے لئے یہاں نہ بھانے سے گھر آیا کرتا تھا اور اب وہ ایک بار بھی اس کا حال پوچھنے نہیں آیا تھا۔ محلے والے، رشتے دار، کالج کی سہیلیاں، لڑکیاں سب ہی اس کے واپس آنے پر طرح طرح کی باتیں بتا رہے تھے۔ گھر میں کوئی اس سے بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ سلمیٰ بیگم یا عدا اس کے کمرے میں کھانا رکھ کر چلی جاتیں۔ وہ کھانا کھائے نہ کھائے اس سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ ثنا تو اندر سے مر گئی تھی۔ زندہ لاش بن کر رہ گئی تھی وہ۔ رسوائی اور تنہائی نے اسے ادھ موا کر کے رکھ دیا تھا۔

”کھانا کھا لو۔“ عدا نے اس کے سامنے ٹرے رکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”لگتا ہے یہ اپنی ساری بھوک پیاس بچھا کر آئی ہے سات دنوں میں۔“ سائرہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے زہر میں بچھا ہوا تیرا اچھالا جس سے وہ لہو لہو ہو گئی۔

”بھابی! آپ بھی مجھے۔۔۔۔۔“

”میں کیا سارا شہر یہی کہہ رہا ہے۔ چلو خدا۔“ سائرہ بھابی نے تنگی سے کہا اور خدا کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ وہ کچھ دیر گم صم بیٹھی رہی، پھر کچھ سوچ کر کھانا کھانے لگی۔ کھانے سے فارغ ہو کر برتن کچن میں رکھنے کے لئے باہر آئی تو لاؤنج میں سے آتی آوازوں نے اس کے قدم روک لئے۔

”کاش! شازندہ واپس نہ آئی ہوتی مرگئی ہوتی تو ہم اسے ایک بار ہی رو لیتے اب تو ہر روز کا روتا ہے۔“ سلسلی بیگم سپاٹ لہجے میں بولیں تو ثنا کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اس کی ماں اس کی موت کی تمنائی تھی۔

”کھانے میں زہر ملا کر دے دیں۔ بیمار تو ہے ہی جلدی رخصت ہو جائے گی۔“ یہ ندا کی آواز تھی۔ ثنا کے لئے اپنے قدموں پر کھڑا رہتا دشوار ہو گیا تھا۔ وہ بمشکل خود کو سنبھالتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی ٹرے میز پر رکھی اور ان سب کو دیکھتے ہوئے لرزتی آواز میں بولی۔

”آپ لوگوں کو قاتل اور مجرم بننے کی ضرورت نہیں ہے میں خود ہی یہاں سے چلی جاؤں گی۔“

”ہاں بھی اب تو چکا لگ گیا ہے آوارہ پھرنے کا اب یہ گھر میں قید ہو کر کیوں رہے گی۔ جاؤ جاؤ ابھی ہمیں رسوا کرنے میں کوئی کسر باقی رہ گئی ہے تو وہ بھی پوری کر دو۔“ بشری بھابی نے بھی زہر اگلا۔

”تمہارے بعد تین بیٹیاں ہیں اس گھر میں ثنابی بی۔ ان پر تمہارے کردار کا منفی اثر پڑ سکتا ہے پھر تمہاری یہ سزا۔“ ندا کی روپوشی ہی بہت ہے۔ کون آئے گا ہماری بیٹیوں کو بیاہنے۔ تم تو منہ پہ کالک مل کے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئی ہو۔ لوگوں کو تو ہمیں ہی فیس کرنا ہوتا ہے نا۔ ابھی ندا کی بھی شادی ہونی ہے۔ تم سے اب کون کسے گا؟ تمہیں شادی کی ضرورت بھی کیا ہے اور جو لڑکی ایک بار اپنی عزت گنوا بیٹھے اسے بار بار بے عزتی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ سائرہ بھابی نے بے حسی اور سفاکی سے کہا۔ اس کے پورے وجود میں میٹھیں گھڑتی چلی گئیں اور غصے سے پھٹ پڑی۔

”بھابی! شرم آتی چاہئے آپ کو اس قدر گھٹیا سوچتی ہیں آپ۔“

”مجھے کیوں شرم آتی چاہئے؟ شرم تو تمہیں نہ آئی جہاں سات دن اور سات راتیں رنگ

رلیاں مناتی رہی ہو وہیں راتیں یہاں کیا لینے آئی ہو؟“ سائرہ بھابی نے شعلہ بار لہجے میں کہا۔

”میں سمجھتی تھی کہ آپ میرے اپنے ہیں۔ میری ساری زندگی آپ سب کے سامنے گزری ہے آپ تو مجھے قصور وار نہیں ٹھہرائیں گے مگر آپ سب تو مجھے ہی مجرم سمجھ رہے ہیں۔ میں بے گناہ ہوں، میں اپنی مرضی سے نہیں گئی تھی۔ میں بے قصور ہوں میں نے کچھ نہیں کیا۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”تم نے تو کچھ نہیں کیا لیکن تمہیں اپنے ساتھ لے جانے والوں نے بہت کچھ کیا ہوگا تمہارے ساتھ۔ انہوں نے کیا شاہی مہمان بنا کر عزت سے رکھا ہوگا تمہیں بولو۔“ بشری بھابی نے جرح کی تو ثنا کا وجود اس گونگے نقاب پوش کے شعلہ بدن کی چنگاریاں محسوس کر کے سلگ اٹھا اور وہ چیختی ہوئی روتی ہوئی اپنے کمرے میں بھاگ گئی اور بستر پر ڈھیر ہو کر بلکنے لگی۔

”ثنایا ریاض تم پر زندگی کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ تمہارے خواب بکھر چکے ہیں تمہیں مرجانا چاہئے۔ ایک آبرو باختہ بیٹی کے لئے ماں باپ کے دل اور گھر میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ باپ کا گھر بھی غیر ہو جاتا ہے، رشتے اجنبی ہو جاتے ہیں، خون سفید ہو جاتا ہے، لہجے میں زہر گھل جاتا ہے، الفاظ نشتر بن جاتے ہیں جو پل پل روح کو گھائل کرتے رہتے ہیں۔ خودکشی حرام نہ ہوتی تو میں کب کا خود کو ختم کر چکی ہوتی۔ یا اللہ اس ذلت بھری زندگی سے تو بہتر ہے تو مجھے موت دے دے۔ میں نہیں ہوں اس آزمائش کے قابل، مجھے بخش دے میرے مولا، میرے گناہ معاف کر دے، مجھے اس ذلت و رسوائی کے غار سے باہر نکال دے مالک!۔“ وہ روتے ہوئے رب کے دربار میں فریاد کناں تھی۔

”سکے رشتے بھی بُرے اور کڑے وقت میں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں میں تو بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی ہوں کوئی بھی تو نہیں ہے میرا کوئی بھی نہیں۔“ وہ روئے جا رہی تھی۔

☆☆☆

وہ اجڑی اجڑی ویران آنکھوں سے خرم کو دیکھ رہی تھی۔ آج نجانے کیوں اچانک چلا آیا تھا مگر جب سے آیا تھا خاموش تھا۔

”تم بولتے کیوں نہیں ہو خرم؟“ تھک کر ثنا نے خود ہی سوال کیا۔

”بولنے کو اب ہمارے پاس بچا ہی کیا ہے؟“

”تم بھی مجھے ہی قصور وار سمجھ رہے ہو خرم تم بھی۔۔۔۔۔“ وہ تاسف سے بولی۔

”سب یہی سمجھتے ہیں۔“ وہ بولا ”ثنا تم۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔“ وہ بولتے بولتے پھر سے

خاموش ہو گیا۔

”میں جانتی ہوں تمہیں مجھ سے اپنی محبت کے دعوے شرمسار کر رہے ہیں میں نے کہا تھا نادیکھیں گے سو وقت نے بہت جلد دکھا دیا تم تو ہر آزمائش میں پورے اُترنے کے دعوے دار تھے نا خرم..... لیکن ایک ہی آزمائش میں تمہارے دعوؤں کا محبت بھرے دعوؤں کا پول کھل گیا ہے اچھا ہوا..... جاؤ خرم تمہاری سانس میری جدائی میں ہرگز نہیں رکیں گی۔ تم میرے بغیر بھی بہت خوش رہو گے۔ اس لئے کہ تم نے مجھ سے کبھی محبت کی ہی نہیں تھی۔ محض دعوے کئے تھے ہے نا۔“ وہ سنجیدگی سے آزدگی سے بولتی اسے شرمندہ کر رہی تھی۔ وہ اس کے خاموش ہونے پر زکا اور متنگی کی انگلی اپنے ہاتھ سے اُتار کر اس کے سامنے رکھ دی اور دروازے کی جانب بڑھ گیا تو شانے کہا۔

”سنو! تم بہت سی باتوں اور دعوؤں کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز بھی بھول رہے ہو۔“

”کیا.....؟“ وہ واپس مڑا۔

”یہ انگلی!“ شانے اس کی پہنائی ہوئی انگلی اُتار کر اس کی طرف بڑھا دی جو اس نے شرمندگی کے عالم میں اس کے ہاتھ سے لے لی۔

”میں چلتا ہوں۔“

”ہاں! تمہیں اب چلے جانا چاہئے کیونکہ یہاں رکنے کا طرف تم میں ہے ہی کہاں؟“ وہ طنز لہجے میں بولی تو وہ نظریں چراتا ہوا تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ بے اختیار ہنس پڑی اور ہنستے ہنستے رونے لگی۔

”تو یہ تھی شان ریاض تمہاری محبت، ایک ناکروہ گناہ نے سب کی حقیقت ظاہر کر دی۔ سارے رشتے ساری محبتیں یکا یک دم توڑ گئیں۔ خرم تم ذرا دیر کو بھی میرے ساتھ قدم ملا کر نہ چل سکے۔ اس ایک واقعے نے مجھ سے کیا کچھ چھین لیا ہے۔“

”شان! کھانا کھا لو۔“ سلٹی بیگم نے ٹرے اس کے سامنے لا کر رکھ دی۔

”امی آپ کیوں زحمت کرتی ہیں، میں خود آکر کھا لیتی۔“ وہ شرمندہ ہو کر بولی۔

”چھوڑو یہ بتاؤ خرم آیا تھا صبح کیا کہہ کر گیا ہے؟“ سلٹی بیگم نے بے چینی سے پوچھا

کیونکہ وہ خرم اور اس کے ماں باپ کے رویوں سے سمجھ تو رہی تھیں کہ وہ اب ان کی شان کو بیاہنا نہیں چاہتے۔

”کچھ نہیں کہا بس یہ واپس کر گیا ہے۔“ اس نے خرم کی دی ہوئی متنگی کی انگلی سائیڈ ٹیبل پر سے اٹھا کر ان کی طرف بڑھا دی۔

”مجھے یہی ڈر تھا اور یہ تو ہونا ہی تھا۔ کون بیاہے گا اب تجھے بد بخت؟“ سلٹی بیگم نے

انگلی پکڑتے ہوئے اس کے خالی ہاتھ کو دیکھ کر خرم کی متنگی پر پہنائی گئی انگلی نہ پا کر غصے و دکھ اور تاسف سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”امی اس میں میرا کیا قصور ہے؟“ وہ رونے کو ہو گئی پھر سے، غیروں کے دیئے زخم کچھ کم نہ تھے۔ اس پر اپنوں کے زہر میں کچھ تیر اس کو اور بھی چھلٹی کر رہے تھے۔

”تیرا قصور نہیں ہے نہ سہی، پر اب میں کیا کروں تیرا بتا مجھے؟“

”جان سے مار دیں مجھے تاکہ آپ سب کی جان ہی بچوٹ جائے۔“ وہ غصے سے پھٹ پڑی۔

”ماں نہ ہوتی تو شاید مار بھی دیتی۔ تیری وجہ سے ہم کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔ عدا کے لئے جو رشتے آئے تھے وہ بھی واپس ہو گئے۔ لڑکے والے کہتے ہیں کہ ہم ایسی لڑکی کو اپنی بیوی نہیں بنا سکتے جس کی بہن کے اغواء کے چرچے پورے شہر کی زبان پر ہوں۔“ سلٹی بیگم نے غصے سے کہا۔

”اے بہن کے مستقبل کا خیال ہوتا تو یہ گھر آنے کی بجائے وہیں کہیں شرم سے ڈوب کر مر گئی ہوتی..... ہونہہ مگر نہ جی یہ تو اپنی ساری شرم باہر اُتار کر آئی ہیں۔“ عدا نے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تو شان کا دل چاہا کہ زمین شق ہو جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ ایسی ذلت، توہین اور ہنک اس کے سکے رشتے بھی کر سکتے ہیں۔ یہ تو اس نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ گھر واپسی پر اسے باہر ہونے والے سلوک سے بڑھ کر ذلت اٹھانا پڑے گی۔

”عدا! تم جاؤ یہاں سے۔“ سلٹی بیگم نے عدا کو سختی سے حکم دیا۔

”امی! مجھے نہیں شنا کو حکم دیں۔ یہ یہاں مہارانی بن کر بستر پر بیٹھ گئی ہیں۔ ہم اس نواب زادی کے نوکر لگے ہیں جو صبح و شام اس کے حضور میں لوازمات پیش کرتے رہیں۔ ہاتھ دیر سلامت ہیں اس کے اپنے کام خود کیوں نہیں کرتی؟“ عدا نے نہایت بدتمیزی سے جواب دیا۔ شاہنشاہ و صبر سے سب کچھ سستی اور سستی رہی۔ سلٹی بیگم غصے سے عدا کو کھینچتی ہوئی باہر لے گئیں۔

”میں کیا کروں یا اللہ! کوئی تو راہ دکھلا دے مجھے کوئی تو وسیلہ بنا دے میرے اس عذاب کو کم کرنے کا۔ رحم کر دے میرے مالک! رحم کر دے مجھ پر۔“ شانے دیوار پر آویزاں خانہ لعبہ کی تصویر کو دیکھتے ہوئے اللہ سے مخاطب ہو کر دعا اور مدد مانگی پھر گہری سانس لے کر کچھ دیر یوں ہی گم صم بیٹھی رہی۔ کھانا سامنے رکھا تھا۔ بھوک مرچکی تھی پھر بھی دو چار نوالے کھا کر رزق کا شکر ادا کرنے کے خیال سے نوالہ توڑ لیا۔ ابھی تیسرا نوالہ حلق سے نیچے اترتا تھا کہ اُسے ابکائی آگئی۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر واش روم کی طرف بھاگی۔ سلٹی بیگم کسی کام سے کمرے میں آئیں تو واش روم کے کھلے دروازے

سے اسے واش بکس میں تے کرتے دیکھ کر لرز کر رہ گئیں۔ وہ اس کا سبب بھی بخوبی جانتی تھیں۔

”یا اللہ! اس قیامت کی کمی باقی تھی بس، تو نے کس امتحان میں ڈال دیا میری بچی کو۔“

کیا لکھا ہے اس کی قسمت میں، اس ذلت سے تو اچھا تھا کہ اسے موت دے دیتا۔ اب کہاں تک چھپائیں گے ہم ذلت و رسوائی کی نشانی کو۔“ سلٹی بیگم نے روتے ہوئے فریاد کی۔ شاہد محال ہی کمرے میں آچکی تھی اور ان کی بات سن کر اس کے دل میں ابھرنے والے خدشے کی بھی تصدیق ہو گئی تھی۔ وہ جس گدھ کی ہوس کا نشانہ بنی تھی اس کے لہو نے اپنا رنگ دکھا دیا تھا۔

سلٹی بیگم اسے تیار کر کے خود اپنی تصدیق و قس کی خاطر گانا لوجسٹ کے پاس لے گئیں۔ جس نے چیک آپ کے بعد تصدیق کر دی کہ شاہد بننے والی ہے۔ شاکی تو ساری ہمت جواب دے گئی تھی یہ سن کر۔

”کیا مام دوں گی میں اس بچے کو۔ اس کے باپ کا۔۔۔۔۔ کیسے بتاؤں گی اسے کہ وہ ناجائز اولاد ہے میری؟“ شاہد نے دل میں کرب سے سوچا۔ وہ اپنی سوچوں میں گم جا رہی تھی کہ اچانک کسی سے ٹکرائی۔

”او آئی ایم سوری۔“ ٹکرانے والے نے فوراً معذرت کر لی۔ نگاہ جب شاہد کے ڈیڑے پرانے بیمار چہرے پر پڑی تو مقابل کو شدید جھٹکا لگا تھا۔

”شاہد آپ شاہی ہیں نا؟“

”جی آپ کون ہیں؟“ شاہد نے الجھن آمیز نظروں سے دیکھا۔

”میں انیس احمد ہوں۔ تعجب ہے آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ عمار کے ویسے میں آپ سے ملاقات ہوئی تھی اور آپ کے گھر بھی تو آیا تھا۔ میں اپنے می ڈیٹی کے ساتھ۔ آپ نے واقعی مجھے پہچانا؟“ انیس احمد نے اس کی سرسوں کی سی رنگت میں بدلی صورت کو دکھ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”انیس بیٹے! یہ تو اپنی پہچان گنوا بیٹھی ہے۔ یہ کسی اور کو کیا پہچانے گی۔“ سلٹی بیگم لیڈی انکڑ سے علیحدگی میں کچھ بات کرتے رک گئی تھیں۔ کمرے سے باہر آئیں تو انیس کو دیکھ کر اس کی تان کر قریب آ کر رہا ہوئیں۔

”میں سمجھا نہیں آئی کیا ہوا ہے شاہد کو ان کی حالت دیکھ کر مجھے بہت شاک پہنچا ہے۔ یہ بے ہیں کیا؟“ انیس احمد نے بے قراری سے پوچھا اور سلٹی بیگم سوچ رہی تھیں کہ کاش انہوں نے شاہد کو احمد سے ہی جلد زیادہ دیا ہوتا جو ان کی بیٹی سے محبت کرتا ہے تو شاید وہ اس حادثے سے محفوظ رہتی۔

”ہاں بیٹا یہ بتا رہا ہے۔“

”کیا ہوا ہے انیس؟“ انیس کی بے چینی عروج پر تھی۔

”اسے جو مرض لاحق ہوا ہے اس کا علاج تو صرف موت ہے۔ چلو شاہد۔“ سلٹی بیگم نے سپاٹ لہجے میں کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گئیں۔

”اللہ نہ کرے کہ شاہد کو مجھ سے پہلے موت آئے کیا ہوا ہے اسے۔“ انیس نے زیر لب کہا اور پھر کسی سوچ نے اس کا رخ ڈاکٹر حمیرا مجید کے کمرے کی طرف موڑ دیا۔

”شاہد تم اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند رکھا کرو اگر تمہاری بھابیوں نے تمہیں اٹھیاں کرتے دیکھ لیا تو وہ پورے خاندان میں چرچہ کر دیں گی۔ جان سے مار دیں گی تمہیں اور باپ۔ بھائیوں میں سے کسی کو خبر ہو گئی تو فوراً تمہیں گولی مار دیں گے اور خود پھانسی چڑھ جائیں گے۔ ہم میں اس گھر کی مزید رسوائی اور جگہ ہنسائی برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ خدا غارت کرے اس ذلیل انسان کو جس نے ہمیں یہ دن دکھائے ہیں۔“ سلٹی بیگم نے شاہد کو اس کے کمرے میں لاتے ہی دروازہ بند کر کے آہستگی سے کہا تو وہ ہارے ہوئے لہجے میں بولی۔

”اُسے بددعا دینے سے کون سا ہمارا امتحان ٹل جائے گا۔ امی پلیز! آپ مجھے کہیں سے زہر لادیں یا میرا گلا دبا دیں، مار دیں مجھے۔“

”میں نے ڈاکٹر حمیرا سے تمہاری جان چھڑانے کی بات کی ہے مگر وہ کہتی ہے کہ اس سے تمہاری زندگی کو خطرہ ہو سکتا ہے کیونکہ تم میں کمزوری بہت ہے اور یہ بھی کہ یہ تو قتل ہے اور وہ اس قتل میں شریک نہیں ہو سکتی۔ اسے کیا خبر کہ یہ ہماری آمد کا قتل ہے۔“

”اب کیا ہو گا امی؟“

”ایک بات میرے دماغ میں آئی ہے انیس احمد کو وہاں دیکھ کر میں اس کی می می فون کر کے کہتی ہوں کہ آکر شاہد کا اور انیس کا رشتہ طے کر لیں۔“ سلٹی بیگم کو اُمید کی ایک ہلکی سی کرن دکھائی دی تو کہنے لگیں۔ شاہد ان کی خوش فہمی پر ہنس پڑی۔

”امی! آپ نے باعزت اور باعفت بیٹی کو ان کو بہو بنانے سے انکار کر دیا تھا اب کیا وہ آپ کی بیٹی کو قبول کر لیں گی؟“

”بات کرنے میں کیا حرج ہے۔ زیادہ سے زیادہ انکار ہو جائے گا اور مزید ذلت کا منہ دیکھنا پڑے گا تو کیا ہوا یہ ذلت اس ذلت سے تو کم ہی ہوگی۔ میں بات کرتی ہوں تمہارے باپ سے لیکن انہیں تمہارے اُمید سے ہونے کا نہیں بتاؤں گی اور تم بھی کسی سے اس کا ذکر مت کرنا۔ اللہ کرے جو میں سوچ رہی ہوں وہ جائے۔“ سلٹی بیگم نے مدہم آواز میں کہا اور اسے دروازہ اندر سے

لاک کرنے کا کہہ کر باہر نکل گئیں۔

”بچوں کی سی باتیں مت کرو سہلی بیگم! ہم بیگم نفیس کو انکار کر چکے ہیں اب اپنے منہ سے کیسے اقرار کر لیں اور کیا وہ ٹاکہ قبول کر لیں گی اب؟“ سہلی بیگم نے ریاض الحق سے بات کی تو وہ برہمی سے بولے۔

”ہم نہیں مگر میں ان سے بات ضرور کروں گی..... میں اپنی بیٹی کو یوں سسکتا، تڑپتا نہیں دیکھ سکتی۔ میں ماں ہوں آخر مجھے جو بھی راستہ بھائی دے گا میں اس طرف قدم ضرور بڑھاؤں گی۔ آپ کے بھائی بھادج تو انکاری ہو گئے ہیں۔ انگوٹھی خرم خود واپس کر گیا ہے۔ اب آپ کس سے اس لگائے بیٹھے ہیں۔ بیگم نفیس کے آنے پر کیسے بڑے بول بولے تھے نا آپ نے اللہ نے شاید اسی کی سزا دی ہے ہمیں۔“ سہلی بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔

”ٹھیک ہے جو تمہارا دل چاہے وہ کرو۔“ ریاض الحق نے بے بسی اور عداوت کے احساس سے چور ہو کر کہا تو وہ بیگم آسیدہ نفیس کو فون کرنے چلی گئیں۔

☆☆☆

”مما! وہ ٹھیک نہیں ہے۔“ انیس احمد ٹوٹا ہوا گھر پہنچا اور سیدھا آسیدہ بیگم کے پاس آکر بولا۔
”کون ٹھیک نہیں ہے کس کی بات کر رہے ہو بیٹا؟“

”ٹٹا کی..... وہ میرے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی مماپلیز آپ ایک بار آخری بار اس کے گھر چلی جائیں۔ اس کے ماں باپ سے اسے میرے لئے مانگ لیں پلیز مم! کسی بھی قیمت پر آپ اسے میرے لئے مانگ لیں ورنہ وہ لوگ اس کو مار دیں گے..... اور اگر وہ مر گئی نا مماتو آپ کا انیس بھی مرجائے گا۔“ وہ ان کے ہاتھ تھام کر پرغم لہجے میں بولا تو وہ دنگ رہ گئیں۔

”اللہ نہ کرے، کیسی دل دکھانے والی باتیں کر رہے ہو۔ ٹٹا تمہاری دلہن بننے کی ضرور بنے گی، پنگے پہلے تم ان لوگوں کے انکار کے صدمے میں پڑ گئے اور اب مرنے کی بات کر رہے ہو۔ خبردار آئندہ ایسی بات کہی۔“ بیگم آسیدہ نفیس نے اس کے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر نرمی سے کہا۔
”آپ وعدہ کریں آپ ٹٹا کے گھر کل ہی جائیں گی۔“

”جاؤں گی میرے چاند کل ہی جاؤں گی..... تمہیں پتا ہے ٹٹا کی امی کا کچھ دیر پہلے فون آیا تھا، انہیں یہ رشتہ قبول ہے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے یہ خوش خبری سنائی۔

”سچ مم!.....“ وہ خوشی سے کھل اٹھا۔

”ہاں میرے چاند بالکل لیکن وہ اس کے علاوہ کوئی بات بتانا چاہ رہی تھیں کہہ رہی تھیں کہ

ان کی بات سننے کے بعد اگر ہمیں کوئی اعتراض نہ ہو تو بے شک اسی جتنے کو بارات لے کر آجائیں۔“
”مما! ان کی بات جو بھی ہو آپ کو اسی جتنے کو ٹٹا کو میری دلہن بنا دینا ہے۔ بس کچھ بھی ہو آپ انکار نہیں کریں گی۔ مم! ورنہ وہ لوگ ٹٹا کو مار دیں گے۔ آپ کے بیٹے کو مار دیں گے۔“ وہ بھیتے، بے قرار لہجے میں بولا اور اٹھ کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ بیگم آسیدہ نفیس الجھن میں مبتلا ہو گئیں۔

☆☆☆

”آپ ٹٹا کے پاس بیٹھ کر باتیں کریں میں آپ کے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ سہلی بیگم اگلے دن آسیدہ نفیس کے آنے پر انہیں ٹٹا کے کمرے میں لاتے ہوئے بولیں۔ ان کی نظر ٹٹا کے چہرے پر پڑی تو حیران رہ گئیں۔

”ارے ٹٹا بیٹی کو کیا ہوا ہے؟“ انہوں نے سہلی بیگم کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
”یہ آپ کو ٹٹا خود بتائے گی میں ذرا کچن سے ہو آؤں۔“ سہلی بیگم یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئیں اور بیگم آسیدہ نفیس احمد ٹٹا کے پاس چلی آئیں اور ان کے سوال کے جواب میں اس نے روتے ہوئے اپنے اوپر گزرنے والی قیامت کا حال کہہ سنایا لیکن اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کے نتیجے میں اُمید سے ہونے والی تلخ حقیقت نہ چھپا سکی تھی۔

”او میرے خدایا! ایک تو ظلم بھی تم پر ہوا اس پر تمہارے انہوں نے تم سے دشمنوں کا سا سلوک روا رکھا ہوا ہے۔ افسوس صد افسوس۔“ بیگم آسیدہ نفیس نے تاسف اور دکھ سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں جانتی ہوں آنٹی کہ آپ بھی مجھے قبول کرنے کا حوصلہ نہیں کر پائیں گی۔ امی نے ناحق آپ کو زحمت دی ہے۔“ وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی تو انہوں نے اس کے سر پر دستِ شفقت رکھ کر نرمی سے کہا۔

”تم مجھے اوروں جیسا مت سمجھو۔ میں تمہیں قصور وار نہیں سمجھ رہی تم ایک بہادر لڑکی ہو۔“
”چائے تیار ہے آپ ڈرائنگ روم میں تشریف لے آئیں۔“ سہلی بیگم نے آکر اطلاع دیتے ہوئے کہا تو وہ کھڑی ہو گئیں۔

”نہیں شکریہ! میں اب چلتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ دروازے کی سمت بڑھ گئیں اور سہلی بیگم کی آخری اُمید بھی دم توڑ گئی۔

”اور ہاں.....“ بیگم آسیدہ نفیس جاتے جاتے دروازے سے پلٹیں تو ان دونوں ماں بیٹی

نے انہیں حیرت سے دیکھا۔ ”پرسوں جیسے کامبارک دن ہے۔ میں اپنے انیس احمد کی بارات لے کر آؤں گی۔ شاہی کو دلہن بنا کر ہمارا استقبال کیجئے گا۔“

”جی..... آ..... آپ سب کچھ جان کر بھی شاہ کو اپنی بہو بنائیں گی۔“ سلٹی بیگم کے چہرے پر روشنی سی پھیل گئی تھی۔ حیرت، مسرت اور بے یقینی کے عالم میں انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

”ہاں اس لئے کہ یہ بچی معصوم ہے یہ شادی بہت دھوم دھام سے ہوگی۔ سب کی زہر اگتی زبانیں بند ہو جائیں گی، ہم بڑی شان سے شاہ کو بیاہ کر لے جائیں گے۔ اب تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے نا اس رشتے پر؟“

”نہیں..... یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے مبارک ہو بیگم نفیس۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ آپ تو فرشتہ بن کر میری بیٹی کی زندگی میں آئی ہیں۔“ سلٹی بیگم نے خوشی سے آبدیدہ ہوتے ہوئے ان کے ہاتھ تھام کر تشکر بھرے لہجے میں کہا۔

”روئیں نہیں سلٹی بہن! شاید شاہی طرح میرے بیٹے کے نصیب میں لکھ دی گئی تھی۔“ بیگم آسیہ نفیس نے انہیں گلے لگا کر کہا اور شاہی حیرت زدہ تھی اور رو بھی رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ خوشی کا کوئی دراب بھی اس کے لئے کھل سکتا ہے۔

”شاہی! اب تم بھی رونا بند کرو تم نے جتنا رونا تھا رو لیا اب تو انشاء اللہ تمہارے مسکرانے اور ہنسنے کے دن شروع ہونے والے ہیں۔“ بیگم آسیہ نفیس نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے پیار سے کہا تو وہ بمشکل مسکراسکی۔ ان کے جاتے ہی سلٹی بیگم نے یہ خوش خبری سب گھروالوں کو سنائی تو سب کو خوشگوار حیرت نے گھیر لیا۔

”واہ بھئی یہ تو قسمت کی دھنی نکلی۔ اتنی رسوائی کے بعد بھی اتنی پذیرائی حاصل ہو رہی ہے۔“ سائرہ بھابی نے کہا۔

”انیس احمد جیسا اسارٹ اور ڈھنگ بندہ اوپر سے کروڑ پتی دیکھو تو کیسا رنگ بدلا ہے شاہ کی قسمت نے۔“ ندانے حسد بھرے لہجے میں کہا۔

”تم دونوں جلنے جلنے کی بجائے شادی کی تیاری کرو۔ اللہ کا شکر ادا کرنے کی بجائے الٹی سیدھی ہانکنے میں لگی ہیں۔“ اسرار الحق نے ان کی باتیں سن کر غصے سے کہا تو دونوں شرمندہ ہو گئیں۔

”کہیں وہ لوگ دھوکا ہی نہ دے دیں۔ ہم نے پہلے انکار کیا تھا وہ اس کا بدلہ نہ لیں۔ بارات نہ لا کر طلاق دے کر۔“ بشری بھابی نے خدشہ ظاہر کیا۔

”تمہارے منہ میں خاک کبھی تو ڈھنگ کی بات کر لیا کرو۔ میں نے تو استخارہ بھی کیا تھا۔ یہ رشتہ نہایت مبارک رہے گا استخارے کی رو سے انشاء اللہ۔“ سلٹی بیگم نے اسے ڈھٹ کر کہا تو وہ منہ بسور کر رہ گئی۔

☆☆☆

”او تھینک یومما! تھینک یو دیری مچ آپ بہت گریٹ ماما ہیں۔ آئی لو یومما آئی ریلی لو یو۔“ انیس یہ خوش خبری سنتے ہی ان کے گلے سے لگ کر خوشی سے بولا تو وہ ہنس پڑیں۔

”آئی لو یو میرے بیٹے۔“

”تھینک یومما۔“

”پنگے ماں کا شکر یہ تھوڑی ادا کرتے ہیں بتا کہ اپنی دلہن کو تحفے میں کیا دے گا؟“ انہوں نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”تحفے میں اپنا آپ دوں گا۔“ وہ ان سے علیحدہ ہوتے ہوئے شرارت سے مسکراتے ہوئے بولا تو وہ ہنس پڑیں۔ ”شریر.....“

”میں ابھی آیا ماما۔“

”کہاں چلے؟“

”سجدہ شکر ادا کرنے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”جیتے رہو اللہ تمہیں اپنی شادی کی، اپنی زندگی کی ساری خوشیاں دکھائے۔“ انہوں نے ممتا بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے دل سے دعا دی۔

”آمین! اینڈ تھینک یو ماما آئی لو یومما۔“ انیس نے اُن کے ہاتھ چومتے ہوئے محبت سے کہا اور شکرانے کے نوافل ادا کرنے چل دیا۔

☆☆☆

شاہ کی شادی نے پورے خاندان میں آگ لگا دی تھی۔ سب کو بذریعہ ٹیلی فون مدعو کیا گیا تھا اور دوستوں، محلے داروں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ سب حیران تھے کہ شاہ کے لئے ایک دم سے ایسا کون سا بدل گیا جو اس اغواء شدہ لڑکی کو قبول کر رہا ہے۔ نفیس احمد بھی بیٹے کی خوشی میں تھے۔ انہوں نے جہیز کے لئے منع کر دیا تھا۔ سلٹی بیگم نے شاہ کی شادی کی کافی تیاری تو کر رکھی تھی۔ کپڑے، جوتے، بستر، زیور بنا رکھا تھا سو وہ تو انہوں نے دینے کے لئے نکلوا لیا تھا۔ شاہ کی بڑی بہت اٹلی تھی۔ ریڈی میڈ ملبوسات سب کچھ ایک دن کے آرڈر پر سلوائے جا رہے تھے۔

زیور کچھ بیگم آسیہ نفیس نے پہلے ہی اپنی چھوٹی بہو کے لئے بنوا رکھا تھا اور دو تین سیٹ انہوں نے مزید خرید لئے تھے۔ ساتھ میں سونے کے کنگن اور چوڑیاں بھی تھیں۔ سلٹی بیگم کے لئے بھی سونے کا لاکٹ سیٹ خریدا گیا تھا۔ ”ریاض لاج“ میں شادی کی تقریب کا اہتمام بہت شاندار کیا گیا تھا۔ جس گھر میں کل تک صف ماتم چمکی ہوئی تھی آج اسی گھر میں نذر شادی گونج رہا تھا۔ شا کا دل ڈرا ہوا تھا۔ اسے یہ خوف ستا رہا تھا کہ اگر انیس نے اسے دل سے قبول نہ کیا تو وہ کیا کرے گی؟ کہاں جائے گی؟ وہ نمازیں پڑھ پڑھ کر اپنے بہتر باعزت اور خوشگوار مستقبل کی دعائیں مانگتی رہی تھی اب تک۔

جلیس احمد اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ چونکہ لندن میں مقیم تھے اور اتنی ایمر جنسی میں پاکستان نہیں آسکتے تھے لہذا ان کے سوا انیس احمد کے تمام رشتے دار دوست احباب انیس احمد کی شادی میں شریک ہوئے اور بہت معزز و اعلیٰ عہدوں پر فائز حضرات ان کے ساتھ بارات لے کر ”ریاض لاج“ پہنچے تھے۔ جہاں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ ایجاب و قبول کی رسم ادا کی گئی تو ”ریاض لاج“ کے کیمپوں کے سروں پر پہاڑ جتنا بوجھ سرک گیا تھا۔ سلٹی بیگم کی آنکھیں خوشی سے بھیگ رہی تھیں وہ اللہ کا شکر ادا کر رہی تھیں کہ اس نے ان کی بیٹی کی عزت رکھ لی تھی۔ اسے مزید تماشا بننے سے بچا لیا تھا۔

یہی حال ریاض الحق کا بھی تھا۔ سب ہی گمراہ لے اب شا کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ ان کے غصے، نفرت اور غم سے جھلے ہوئے چہروں پر جیسے بہار آگئی تھی۔ جب شا کی بڑی دکھائی گئی تو خاندان بھر کی عورتوں نے حیرت سے اپنی انگلیاں دانتوں تلے داب لیں۔ سب کی آنکھیں حیرت اور حسد سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”اغواء شدہ اور داغ دار لڑکی کے لئے ایسا اصول بر اور بڑی..... واہ رے اللہ تیرے شان۔“ زگس بیگم نے حسد سے جلتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”شا بہت معصوم بچی ہے۔ اسے بدکردار کہنے اور سمجھنے والے دراصل خود بے کردار اور سطحی سوچ کے مالک ہیں۔“ بیگم آسیہ نفیس نے زگس سمیت ہر اس عورت کو یہی جواب دیا جو اس قسم کی گویا افشانی کر رہی تھی اور سب کے منہ بند ہو گئے۔ شا کا حق مہر پانچ لاکھ روپے بیگم آسیہ اور نفیس احمد نے اپنی مرضی سے لکھوایا تھا حالانکہ ریاض الحق تو شرعی حق مہر لکھوانے پر اصرار کر رہے تھے۔

شا کو انیس احمد کی سنگت میں دعاؤں کے سائے میں رخصت کر دیا گیا۔ ”نفیس ولا“ پہنچنے پر شا کا ایسا شاندار استقبال کیا گیا کہ اسے لمحے بھر کو تو یوں لگا جیسے وہ کسی جنت میں آگئی ہو۔ سرخ

قالین بیروں تلے بچھا تھا۔ دائیں بائیں کھڑی لڑکیاں شوخ جملوں اور تہقہبوں کے ساتھ اس پر اور اس کے مجازی خدا پر ہنحوں کی برسات کر رہی تھیں۔ بیگم آسیہ نفیس نے بھو اور بیٹے کا صدقہ اتارا۔ چار کالے بکروں کا صدقہ علیحدہ سے دیا گیا۔

دلہا دلہن کو عالی شان ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد فوٹو سیشن ہوا۔ مووی بھی مسلسل بن رہی تھی۔ ضروری رسومات کی ادائیگی کے بعد دلہن کو جلد عروسی میں پہنچا دیا گیا۔ جلد عروسی کی شان بھی نرالی تھی۔ پھولوں، کلیوں، ستاروں سے مہکتی جھللاتی ہوئی بیج وسیع و عریض بیڈ روم میں صوفہ سیٹ، ٹی وی سیٹ، ڈیک، جہازی ساز کا بیڈ، ڈریسنگ ٹیبل، ہلکے نیلے رنگ کے پردے لگے تھے۔ براڈن رنگ کا قالین فرش کی زینت بنا ہوا تھا اور وہ یہ سب دیکھ کر حیران ہوئی جا رہی تھی۔

”یا اللہ! وہ خواب تھا یا یہ خواب ہے؟ کیا ہے یہ سب ایک بے آبرو لڑکی کی اس قدر پذیرائی..... یا اللہ وہ جگ ہنسائی اور رسوائی خواب تھی کہ یہ محبت بھری پذیرائی خواب ہے؟“ اور خود شا دلہن کے روپ میں کسی شہزادی سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ سرخ عروسی جوڑے پر سنہری کام کیا گیا تھا۔ اس پر طلائی زیورات، کلیوں کے بار، گجروں، چوڑیوں کی آرائش نے اس کے کُسن کو چار چاند لگا دیئے تھے۔

جلد عروسی کا در بہت آہستگی سے وا ہوا تھا اور شا کے دل کا ایک ایک گوشہ لرزنے لگا تھا۔ انیس احمد دروازہ لاک کر کے اپنی شیروانی کے بٹن کھولنے لگا۔ وہ سفید کرتا پا جامہ اور سیاہ جدید فیشن کی شیروانی کلاہ میں بہت وجیہ لگ رہا تھا۔ شیروانی اور کلاہ وارڈروب میں رکھنے کے بعد وہ دلہن کی بیج کی جانب بڑھا تو بہت مسرور تھا۔

”السلام علیکم!“ وہ خوشگوار لہجے میں سلام کرتے ہوئے اس کے روبرو بیٹھ گیا۔ شانے جواب تو دیا مگر صرف ہونٹ ہی ہلے آواز حلق سے نہ نکل سکی تھی۔ انیس احمد نے اُسے مسکراتے ہوئے بہت والہانہ پن سے دیکھا تھا۔ شا کے ہاتھ خوف سے کانپ رہے تھے۔

”یہ ہے آپ کی رونمائی کا تحفہ۔“ انیس نے ہاتھ میں موجود مخملی ڈبیہ کھول کر اس میں سے ہیرے کی بہت قیمتی انگوٹھی نکالی اور اس کے کانپتے ہاتھ کو تمام کر اس کی مخروطی انگلی کی زینت بنا دی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر نرمی سے سہلانے لگا۔ شا کے وجود میں جیسے کرنٹ سا دوڑ گیا۔ وہ ڈری ڈری، گھبراہٹ کی گھبراہٹ اس کے آتش شوق کو ہوا دے رہی تھی۔

”شا! میں پہلی نظر کی محبت پر کبھی بھی یقین نہ کرتا۔ اگر مجھے تم سے پہلی نظر میں محبت نہ ہو جاتی۔ آئی لو یو ٹارگیل لو یو۔“ انیس نے محبت پاش لہجے میں کہا تو اس کی جھکی ہوئی پلکیں اوپر اٹھیں،

نظر کے سامنے انیس کا خوبو چہرہ تھا۔ دل آپ ہی آپ بے قابو ہونے لگا۔

”آپ..... آپ جانتے ہیں جو کچھ میرے ساتھ ہوا؟“

”ہاں جانتا ہوں۔“

”سب کچھ.....؟“

”ہاں سب کچھ۔“

”پھر بھی آپ نے مجھ سے شادی کر لی، کیوں؟“

”کیونکہ میں نے تم سے محبت کی ہے، تمہیں پانے کے لئے دن رات دعائیں مانگی تھیں۔ اب تم میرے نام سے پچپانی جاؤ گی۔ بھول جاؤ اپنے ماضی کو تمہارا حال میں ہوں، تمہارا مستقبل مجھ سے وابستہ ہے، اس لئے میرے بارے میں سوچو، غصے دیکھو، مجھے پرکھو، مجھے چاہو۔“ وہ اس کی ٹھوڈی پکڑ کر اسے نرمی سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”کیسے بھول سکتی ہوں میں ماضی کی تلخیاں؟ میرا وجود کسی کے گناہ کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔“ وہ بھگتے لہجے میں بولی۔

”میں جانتا ہوں کہ تم امید سے ہو۔“

”آپ کو کس نے بتایا؟“ اس نے حیرانگی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ڈاکٹر حمیرا سے اس روز میں نے معلوم کر لیا تھا۔“

”پھر کیوں کی آپ نے مجھ سے شادی؟“

”کیونکہ میری نظر میں تم باعفت اور پاکردار ہو، پاکیزہ اور مقدس ہو۔“

”جھوٹ بول رہے ہیں آپ۔“ وہ اسے جھٹلاتے ہوئے سختی سے بولی۔ ”میری کوکھ میں

کسی کے گناہ کا پھل پروان چڑھتے کیسے دیکھ سکتے ہیں آپ.....؟ میں اس عذاب سے چھٹکارا پانا چاہتی ہوں پلیز میری مدد کریں..... میں اس بچے کو جنم نہیں دینا چاہتی۔“

”ایسا کرنے سے تمہاری زندگی کو خطرہ ہے اور میں ایسا کوئی رسک نہیں لوں گا اور اس منہی جان کا کیا قصور ہے جو تم اسے مارنے پر آمادہ ہو؟“ انیس نے سنجیدہ مگر دھیمے لہجے میں کہا۔

”مٹا پلیز مت روؤ جو ہو چکا ہے اسے قبول کر لو جب میں تمہارے ساتھ ہوں تو تمہیں کس بات کا ڈر ہے۔ میں اس بچے کا اپنا نام دوں گا۔ یہ بچہ ہم دونوں کا کہلائے گا۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

”لیکن.....“

”کوئی لیکن ویکن نہیں، ورنہ میں خود کو ختم کر لوں گا۔ شادی کی پہلی رات ہی بیوہ ہو جاؤ گی تم پھر کیا نام لکھو گی اس بچے کی ولدیت کے خانے میں ہاں۔“ وہ خشکی سے بولا تو وہ سہم گئی اور روتے ہوئے بولی۔

”بس یہی محبت ہے آپ کی۔ شادی کی پہلی رات ہی مجھے بیوہ کرنے کی بات کر رہے ہیں۔ میں تو پہلے ہی مر رہی ہوں زندگی کی راہ دکھا کر مجھے بالکل مار دینا چاہتے ہیں آپ؟“

”نہیں میری جان! میں تو تمہیں پیار دینا چاہتا ہوں آئی ایم سوری اب نہ تم ایسی فضول بات کرنا نہ میں ایسی بات کہوں گا اوکے۔“ وہ اسے اپنی بانہوں میں لے کر محبت سے بولا تو اس نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

”گڈ اچاؤم کپڑے چینج کر لو تھک گئی ہو گی نا، پھر آرام سے سو جانا۔“

انیس نے بہت پیار سے کہا اور اسے سہارا دے کر بیڈ سے اتارا اور اسے ڈریسنگ روم تک چھوڑ کر خود بیڈ پر آکر لیٹ گیا۔ وہ جانتا تھا شاید اس کی کیفیت سے دو چار ہے اس لئے اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اسی میں بہت مسرور تھا کہ اس کی محبت اس کی پناہ میں آگئی تھی اور شاید اس کی اس خیال کرنے والی ادا نے بہت متاثر کیا تھا۔ وہ اس کی بہت ممنون تھی۔

وہ لباس تبدیل کر کے کمرے میں آئی تو انیس سوچکا تھا۔ شاید وہ بھی تھکا ہوا تھا یا شاید وہ جھپکنے کترانے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ شاید اسے دیکھا اور اس سے کچھ فاصلے پر بیڈ پر آکر لیٹ گئی۔ آنکھیں موندیں تو نیند کی دیوی لمحوں میں اس پر مہربان ہو گئی۔

صبح اس کی آنکھ انیس کے جگانے پر کھلی تھی۔ اسے اپنے پاس بیٹھا دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور جلدی سے دوپٹہ شانوں پر پھیلا لیا۔ وہ ہنس کر بولا۔

”سوری یار جگانا تو نہیں چاہئے تھا لیکن کیا کرتا ممدو بار خود بلائے آچکی ہیں۔ ناشتہ تیار ہے نیچے دو لہا دو لہن کا انتظار ہو رہا ہے اس لئے جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“ اور شاید حجاب میں گھری اٹھ کر تیار ہونے لگی۔

☆☆☆

دو دن بعد وہ اپنی مون کے ارادے سے مری چلے آئے۔ انیس نے اس رشتے کے حوالے سے شاید اس کی حالت و کیفیت کے سبب اب تک نہیں جتایا تھا اپنا حق استعمال نہیں کیا تھا کیونکہ اس کے قریب آنے پر معصوم بچے کی طرح خوفزدہ سی ہو کر پیچھے ہٹنے لگتی تھی۔ ماضی کی اس تاریک شب کے سفاک لمحوں کی ادا شناسی نے چشم خیرت کو سہم ناکی کا مستقل روگ دے دیا تھا۔ آج جب رات کو

انہیں اس کے قریب آکر لیٹا اور اس نے اُسے ابھی اٹھو ابھی تھا کہ وہ خوف سے چیختے لگی۔

”نہیں..... مجھے مت اٹھو نا..... مجھے مت اٹھو نا پلیز.....“

”ٹٹا! ٹٹا! ہوش میں آؤ میں انہیں ہوں۔“ انہیں نے ٹپٹا کر اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ وہ لوگ ایک ریست ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے اور انہیں کوڑ تھا کہ کہیں ریست ہاؤس کا عملہ ٹٹا کی چیخیں سن کر نہ چلا آئے۔ وہ کچھ نہ کر کے بھی شرمندہ ہو رہا تھا۔

”لائٹ کیوں بند کی ہے..... لائٹ جلا دیں پلیز۔“ وہ روتے، لرزاتے لہجے میں بولی تو انہیں نے بیڈ سے اتر کر فوراً لائٹ آن کر دی۔ وہ سبھی سکڑی بیٹھی رو رہی تھی، کانپ رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر انہیں کا دل ڈوبنے لگا۔

”یا اللہ! میں کیا کروں کہ ٹٹا کے دل و دماغ سے اس واقعے کا خیال جاتا رہے یہ تو اپنے اندر خوف پال رہی ہے اوگا ڈ میری مدد فرما۔“ انہیں نے بے بسی سے باواز بلند اللہ تعالیٰ سے فریاد کی تو ٹٹا کو جیسے ہوش سا آگیا۔ وہ اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہونے لگی۔

”ٹٹا میں ہوں تمہارا انہیں۔ مجھ سے مت ڈرو جان! اب میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا شاباش لیٹ جاؤ سو جاؤ۔“

انہیں نے اس کے پاس آکر اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے پیار سے کہا اور اُسے پکڑ کر لٹا دیا اور کیبل اس کے اوپر پھیلا دیا۔

”لائٹ بند مت..... کیجئے گا۔“ وہ کانپتی آواز میں بولی۔

”اچھا نہیں کروں گا تم سونے کی کوشش کرو۔“ انہیں نے بیڈ کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے نرمی سے کہا تو اس نے آنکھیں موند لیں۔ انہیں دھیرے دھیرے نرمی سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا کچھ دیر بعد وہ نیند کی وادی میں اتر چکی تھی اور انہیں، اس کی آنکھوں کو رت جگا سوئپ دیا تھا اس کے اس رد عمل نے..... وہ بہت دیر تک کمرے میں ٹھہتا رہا پھر وضو کر کے تہجد کی نماز کی نیت کر کے جائے نماز پر کھڑا ہو گیا۔

صبح وہ اٹھی تو انہیں سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔ اپنی رات والی حرکت پر وہ بہت پشیمان تھی لیکن ایسا اس نے جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔ وہ تو خود بخود ہو گیا تھا۔ انہیں اس کی کیفیت محسوس کر رہا تھا، دیکھ رہا تھا اسے وہ ناشتے کے وقت بھی خاموش نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ چپ تو وہ بھی تھا لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا تھا اور اس خاموشی کو توڑتے ہوئے ٹٹا کے لئے سلاکس پر جیم اور مکھن لگا کر اس کے سامنے پلیٹ میں رکھتے ہوئے بولا۔

”لیجئے جیم صاحب! ناشتہ شروع کیجئے۔“

ٹٹا نے اس کی جانب دیکھا وہ بڑے گمن انداز میں کپ میں چائے اڈیل رہا تھا۔ وہ اس سے معذرت کرنا چاہتی تھی لیکن زبان اور ہمت ساتھ نہیں دے رہے تھے سو چپ چاپ سلاکس اٹھا کر کھانے لگی۔ آدھا سلاکس کھاتے ہی اسے متلی ہونے لگی اور وہ تیزی سے اٹھ کر واش روم کی جانب دوڑی۔ کھایا پیا سب تے کے ذریعے باہر آگیا تھا۔ انہیں نے اپنے لئے سلاکس پر مکھن لگایا تھا لیکن اب ٹٹا کی حالت دیکھ کر اس کا بھی کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ چائے کے دو گھونٹ بھر کر اٹھ گیا۔

”آپ مجھے اس مصیبت سے نجات دلانے میں میری مدد کیوں نہیں کرتے؟“ ٹٹا نے کرنے میں آتے ہی غڑ خال لہجے میں اس سے کہا۔

”میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں میں تمہاری جان کا رسک نہیں لے سکتا اور ایسا کرنے سے تم آئندہ کے لئے اولاد کی نعمت سے محروم بھی ہو سکتی ہو طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور یہ تو ایک معصوم جان کا قتل ہوگا۔ ٹٹا تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ اللہ بھی ناراض ہوگا ہمارے اس فعل سے اور جب میں اس بچے کو اپنا نام دے رہا ہوں تو تمہیں کیا پریشانی ہے ہاں؟“ وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے نرمی سے اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”لیکن یہ بچہ آپ کا تو نہیں ہے۔“

”تمہارا تو ہے نا۔“

”میرا بھی نہیں ہے۔“

”پاگل لڑکی! بچہ تمہارے ہوا کس کا ہو سکتا ہے تم ماں ہو اس بچے کی، بچہ تو تمہارا ہی ہوا نا۔“ وہ اُسے نرمی سے سمجھا رہا تھا۔

”مگر میں اسے نہیں پالوں گی۔“ وہ روہانسی ہو کر بولی۔

”تو کون پالے گا؟“

”دے دیجئے گا کسی یتیم خانے کو یا کسی بے اولاد جوڑے کو۔“

”کیوں دیں ہم اپنا بچہ کسی کو؟“ انہیں نے اس کے سامنے آکر سپاٹ لہجے میں کہا۔

”کیونکہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”ہاں ہم تو جیسے پہلے ہی درجن بھر بچوں کے مایا ہیں نا کہ ہم اپنا بچہ کسی غیر کی جمولی میں ڈال دیں۔ یہ بچہ تمہاری گود میں ہی پروان چڑھے گا..... اور اگر تم اسے ختم کرنا چاہتی ہو تو ایسا

کرنے سے پہلے تم مجھے ختم کر دینا۔“ وہ سپاٹ اور اٹل لہجے میں بولا۔

”ایسا مت کہیے پلیز! میرا اب کون ہے آپ کے ہوا؟ آپ کے بغیر تو میں پھر سے ذلت و رسوائی کے گڑھے میں گر جاؤں گی، بے سائبان ہو جاؤں گی۔“ وہ اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر تڑپ کر روتے ہوئے بولی۔

”اچھا روؤ مت پلیز! تمہارے یہ آنسو مجھے رات بھر بے چین کئے رکھتے ہیں۔ میں تمہارا ہوں تمہارے ساتھ ہوں پھر کیوں ڈرتی ہو تم بھول جاؤ گزرے لحوں کو، مت دہراؤ ماضی کو تمہارا آج اور کل اب میں ہوں مجھ پر بھروسہ کرو ٹٹا۔“ وہ اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے اس کے آنسو پونچھ کر نرمی سے بولا۔

”آپ پر تو بھروسہ ہے لیکن تقدیر سے ڈر لگتا ہے اگر وہ شخص کبھی اچانک میرے سامنے آ گیا تو.....“

”تو کیا تم اسے پہچان لو گی۔“

”نہیں، اس نے اپنا چہرہ سیاہ ماسک میں چھپا رکھا تھا لیکن اگر کبھی وہ دوبارہ میرے سامنے آیا تو میں اسے گولی مار دوں گی، ختم کر دوں گی اسے۔“ وہ غصے سے نفرت اور آنسوؤں میں بھیکتے لہجے میں بولی۔

”نی الحال تو تم آرام کرو اور ایک بات اور آئندہ ہمارے بیچ اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوگی۔ ہم یہاں ہنی مون منانے آئے ہیں رونے زلانی نہیں آئے..... تم بھی عجیب لڑکی ہوا تنے رومیٹک ماحول میں اتنی آن رومیٹک گفتگو کر رہی ہو۔ میں تمہارا دھیان بٹانے، دل پہلانے کے لئے یہاں لایا ہوں اور تم ہو کہ خیر چھوڑو تم ناشتہ کرو اپنی صحت کا خاص خیال رکھنا ہے اب تمہیں۔“ وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ وہ مزید شرمندہ ہو گئی۔ وہ اس کا اتنا خیال رکھ رہا تھا اور وہ تھی کہ اسے مسلسل ہرٹ اور نفرت انداز کئے جا رہی تھی۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ اسے جیکٹ چھین کر دروازے کی جانب بڑھتے دیکھ کر اس نے فوراً پوچھا۔

”باہر مارکیٹ تک جا رہا ہوں۔“ وہ اس کی جانب دیکھے بغیر جواب دے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ اس کے رویے کی وجہ سے ہرٹ ہوا ہے اور خفا بھی ہے اس لئے اکیلا چلا گیا ہے۔ اس نے دروازہ اندر سے لاک کر لیا۔

”میں کیا کروں اتنے پیارے شخص کو خفا کر کے میں کب خوش ہوں؟“ وہ بیڈ پر بیٹھتے

ہوئے بے بسی سے بولی۔

”ٹٹا تم خوش نصیب ہو کہ انیس جیسے اعلیٰ ظرف اور کشادہ دل انسان کی شریک حیات بنی ہو۔ اس نے تمہیں، تمہاری ذات سے وابستہ ہر ذلت، بدنامی اور رسوائی سمیت دل و جان سے قبول کیا ہے۔ حد یہ ہے کہ تمہارے وجود میں پھونسنے والی کوئیل کو بھی اپنا نام دے رہا ہے تمہاری پیشانی پر لگا داغ اپنی محبت کے پانی سے دھو رہا ہے اور تم اس شخص کو اپنی محبت سے، اس کے جائز اور شرعی حق سے محروم رکھے ہوئے ہو..... اس نے تو تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی، پھر تم کیوں اس کے ساتھ یہ زیادتی کر رہی ہو؟ بھول جانے میں ہی عافیت ہے، اللہ کا شکر ادا کرو اور انیس کو اپنی محبت کا یقین دلا کر اسے منالو۔ وہ بہت محبت کرتے ہیں تم سے..... ایک خرم تھا جس کی محبتیں محض دعویٰ تھیں، باتیں تھیں اور ایک انیس احمد ہیں جن کی محبت عمل سے شروع ہو کر عمل پر محیط ہو جاتی ہے۔ اپنے آج اور آنے والے کل میں جینا سیکھو ٹٹا..... یہ مت دیکھو اور سوچو کہ گزرے ہوئے کل نے تمہیں کیا دیا ہے.....؟ یہ دیکھو اور سوچو کہ آج اور آنے والا کل تمہیں کیا دے رہا ہے..... اپنے دامن میں پڑے ماضی کے دکھوں کے پتھر پھینک دو ورنہ یہ پتھر تمہیں تمام عمر لہو لہان کرتے رہیں گے۔ لہذا اپنے دامن میں کھلنے والے بھولوں پر نظر رکھو جو انیس احمد کی محبت سے جھک رہے ہیں۔“

ٹٹا کے دل و دماغ نے اسے سمجھایا تو ان کی باتیں اس کی سمجھ میں آ گئیں۔ اب وہ اس کے آنے کی خطر تھی لیکن پانچ گھنٹے گزر جانے کے باوجود جب وہ نہیں آیا تو ٹٹا کی جان پر بن آئی۔ وہ انجان جگہ پر اکیلی تھی۔ ہمت کر کے وہ کمرے سے ہی نہیں ریسٹ ہاؤس سے بھی باہر نکل آئی اور انیس کی تلاش میں چاروں طرف نگاہ دوڑا کر دیکھا تو اسے دائیں جانب ایک ہوٹل کے باہر رکھے سنگی بیچ پر بیٹھا دکھائی دیا۔

”یا اللہ اتیرا شکر ہے۔“ ٹٹا کی جان میں جان آئی وہ کلمہ شکر ادا کرتی ہوئی تیزی سے اس کی جانب بڑھی تھی اور اس کے قریب پہنچنے ہی شکوہ کناں ہوئی۔

”آپ..... یہاں بیٹھے ہیں اور میں وہاں اکیلی پریشان ہو رہی ہوں کب سے، ایک اجنبی جگہ پر آپ مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے آئے۔“

”آئی ایم سوری تم چلو میں آتا ہوں۔“ انیس نے چونک کر اس کے چہرے کو دیکھا جہاں سچ پریشانی اور خوف تھا۔ وہ شرمندہ ہو کر بولا۔

”نہیں آپ بھی میرے ساتھ چلیں مجھے وہاں ڈر لگ رہا تھا۔“

”اچھا چلو۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر خاموشی سے اس کے ساتھ چلا ہوا،

”ریسٹ ہاؤس“ آگیا۔

”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ ثناء نے اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”جان! بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔ صبح سے ہم دونوں تے کچھ کھایا ہی نہیں ہے۔ میں ابھی کھانا منگواتا ہوں پھر مل کر ہی کھائیں گے۔“ انیس نے مسکرا کر اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا اور پھر کھانے کا آرڈر دے دیا۔ کھانا آیا تو دونوں نے بہت خاموشی سے کھایا۔ پھر وضو کر کے عصر کی نماز ادا کی اور اس کے بعد انیس ٹی وی آن کر بیٹھ گیا اور ثناء بھی خاموشی سے ٹی وی دیکھنے لگی مگر جلد ہی وہ اکتاہٹ مٹی اور اٹھ کر کمرے سے باہر آگئی۔ انیس نے کن اکیوں سے اُسے جاتے ہوئے دیکھا۔ کافی دیر کے بعد بھی جب وہ واپس نہ آئی تو انیس کو تشویش لاحق ہوئی۔ وہ اٹھ کر باہر آگیا وہ بالکونی میں کھڑی دُور آفتاب پر نجانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اُداسی رقم تھی۔ انیس لب کاٹنے لگا اور سرد ہوا کے جھونکے نے اسے کاٹنے پر مجبور کیا تو وہ بڑھ کر ثنا کے قریب آیا اور اس کے شانوں پر پیچھے سے ہاتھ رکھ دیئے۔ ثناء نے شیشا کر گرون گھمائی۔

”اندر چلو ٹھنڈ لگ جائے گی میری غلطی کی سزا خود کو کیوں دے رہی ہو؟“ وہ نرمی سے بولا۔

”آپ کی غلطی.....“ وہ کبھی نہیں اس کا اشارہ کس جانب تھا۔

”ہاں بھی میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر کئی گھنٹے باہر جو رہا ہوں آؤ شاباش رات ہو رہی ہے۔“

وہ محبت سے بولتا اسے اپنے ساتھ لگائے کمرے میں لے آیا۔ رات کو جب سونے کا وقت ہوا تو انیس بیڈ پر لیٹنے کی بجائے تکیہ اٹھا کر صوفے پر آگیا۔ ثناء نے حیرت سے اسے دیکھا اور پوچھا۔

”آپ صوفے پر سوئیں گے کیا؟“

”ہاں!“

”کیوں.....؟“

”میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم تکلیف محسوس کرو اور سکون سے سو ہی نہ سکو۔“ انیس نے

سنجیدگی سے جواب دیا تو وہ شرمندگی سے زمین میں گڑھ مٹی اور پھر چند لمحوں بعد خود کو سنبھال کر بولی۔

”آپ پلیز بیڈ پر آ کر سوئیں، میری نیند تو ویسے بھی خراب ہو چکی ہے۔“

”جیسی تو میں بیڈ پر نہیں سونا چاہ رہا۔“ انیس نے اس کی بات سن کر کہا۔

”میں آپ کو صوفے پر بھی سونے نہیں دوں گی۔“

”اچھا بابا نہیں سونا صوفے پر لو آگیا بیڈ پر اب خوش۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا اور بیڈ پر

آ کر نیم دراز ہو گیا۔

”آپ خفا ہیں مجھ سے؟“ وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ انیس نے کوئی جواب نہیں دیا ثناء نے بے قرار ہو کر اسے دیکھا اور دلگیر لہجے میں کہا۔

”آئی ایم سوری۔“

”سوری مگر کس لئے.....؟“

”کل رات میں نے آپ کو ہرٹ کیا تھا نا۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا؟“ وہ نظریں جھکائے ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پیوست کرتے ہوئے بھیکے لہجے میں بولی تو انیس کو اس پر بے اختیار پیار آنے لگا۔

”مجھے تم پر گزری قیامت کا اندازہ ہے۔ ثناء میں تمہاری کیفیت سمجھ سکتا ہوں۔ تمہارے دکھ کو سمجھ سکتا ہوں لیکن میری جان، زندگی کسی ایک سانحے، واقعے یا حادثے پر ختم نہیں ہو جاتی۔ جب تک سانس باقی ہیں اسے تو جاری رہنا ہے تو اچھا نہیں ہے کہ ہم اس زندگی کو کبھی خوشی پیار محبت سے گزارنے کی کوشش کریں..... اور ثناء میری جان میں تمہارا شوہر ہوں۔ تم بیوی ہو میری اور میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں۔ ان کی ہر خوشی اور راحت ایک دوسرے سے وابستہ ہوتی ہے لیکن اگر تمہیں میرا قرب تکلیف دیتا ہے تو میں آئندہ تمہیں نہیں بچھوؤں گا۔ بس تم رویا نہ کرو تمہاری آنکھوں کے آنسو میری آنکھوں کے رت جگے بن جاتے ہیں۔“ وہ اس کے چہرے کو محبت سے دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔

”پلیز! مجھے معاف کر دیجئے میں جانتی ہوں آپ صحیح کہہ رہے ہیں..... میں آئندہ خیال رکھوں گی۔ آپ نے مجھے محبت دی ہے بھلا مجھے آپ سے کیوں تکلیف ہوگی؟“ وہ اس کے چہرے کو پر غم آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”کئی بات ہے؟“ انیس نے مسکراتے ہوئے اس کی شرعی آنکھوں میں دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تو پھر یہاں آؤ۔“ انیس نے مسکراتے ہوئے اپنی بانہیں پھیلا کر کہا تو وہ لمحے بھر کو جھنجکی مگر اب وہ اسے مزید امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی سو فوراً اس کی مہربان بانہوں میں آسائی اور اس کے کشادہ سینے پر سر رکھ کر سکون ہو گئی۔ انیس نے اسے متاع حیات کی طرح سمیٹ لیا تھا۔

چاند شب شانوں سے سرکئی جا رہی تھی۔ چاند اس کے آنچل میں ستارے ٹانگ رہا تھا۔ کتنی خوبصورت، انوکھی اور حسین رات تھی یہ انیس کی محبت بھری باتیں، اس کے پیار کا لمس، اس کی چاہت کا جادو ثناء کے پورے وجود کو سرشار، سیراب، شاداب کرتا جا رہا تھا۔

وہ رات بھرا سے اپنی محبتوں کا خراج پیش کرنے کے بعد صبح نیند کی وادی میں اتر گیا، وہ بہت مسروری اس کے چہرے کو محبت سے دیکھ رہی تھی جو کسی معصوم بچے کی مانند لگ رہا تھا۔ شا کے دل میں اس کے لئے محبتوں کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ وہ اسے سکے جارہی تھی۔ محبت اور چاہت سے، جس کی محبتوں نے اس کی زندگی کی غمزدہ، تاریک شب میں مسرتوں کا ماہتاب روشن کر دیا تھا۔

اور پھر انیس احمد کی سنگت میں گزرتا ہر دن، ہر شب ہر پہلے شا کے تن و من میں گلاب کھلاتا جا رہا تھا وہ بہت خوش تھی انیس احمد کے لئے اس کا دل محبت سے بھرا ہوا تھا۔ وہ انیس کی بے حد ممنون تھی کہ جس نے اس کی مانگ میں اڑتی راکھ کو اپنے پیار کی افشاں میں بدل ڈالا تھا۔ اس کے تار تار آج کل کو ستاروں سے ٹانگ کر بھر دیا تھا۔ وہ دونوں پندرہ دن تک شمالی علاقہ جات میں سیر کرنے کے بعد گھر واپس لوٹے تو ان دونوں کے چہروں پر بہت تازگی اور شادابی تھی۔ جسے دیکھ کر سب نئی گھروالے بہت خوش تھے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوشگوار لحاظ گزار رہے ہیں۔

ندا "نقیس ولا" شا سے ملنے آئی ہوئی تھی۔ شانے اُسے پورا گھر دکھایا پھر چائے کے ساتھ ڈھیروں لوازمات سے اس کی تواضع کی۔ باقی گھروالے کہیں گئے ہوئے تھے اس لئے شا کو کیلے ہی اسے کہنی دیتا تھی۔ عدا دیکھ رہی تھی کہ شادی کے ایک مہینے کے اندر اندر ہی شا مکمل کر پھر سے گلاب بن گئی تھی۔ اس کے چہرے کی سرخی اور بڑھ گئی تھی۔ سیاہ ویلوٹ کے نقیس سوٹ میں سیرے کا نازک سائیٹ پہنے وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ عدا کو اس سے حسد محسوس ہو رہا تھا۔ بہن! خوشی اسے ایک آنکھ نہیں بھاری تھی۔

"ناتم خوش تو ہونا یہاں؟" ندانے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں اللہ کا شکر ہے میں بہت خوش ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"حالانکہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا تھا اس کے بعد تو تمہیں شرم سے ڈوب مرنے چاہئے تھا۔ خدا کشتی کرنے کی بجائے تم خوش خوشی زندگی بسر کر رہی ہو۔ بہت ہی ڈھیٹ ہو بھی تم تو۔" ندانے ہر افشانی کی تو اس کا دل چھلٹی ہو گیا۔

"جب میرا کوئی دوش ہی نہیں تھا تو میں کیوں حرام موت مرنے؟ تم لوگوں کو تو خوش ہونا ہے کہ مصیبت سے؟ باری جان چھوٹ گئی ہے ہمیشہ کے لئے۔ انیس بہت اچھے انسان ہیں تو پھر خدا خوش کیوں نہ رہوں۔ اللہ کا شکر ادا کیوں نہ کروں؟" شانے اپنی ہمت مضبوط کر کے سنجیدہ لہجہ لہا۔

"تمہیں انیس بھائی بزنس ڈنر وغیرہ میں تولے جاتے ہوں گے۔ سنا ہے کہ امیر آدمی

خوبصورت بیوی کے عیب صرف اس لئے کھلا دیتا ہے کہ اسے بیوی کی خوبصورتی اور حسن کو اپنے بزنس کی ترقی کا زینہ بنانا ہوتا ہے تمہارے شوہر تمہیں طعنہ تو ضرور دیتے ہوں گے اغواء شدہ اور زسوا لڑکی ہونے کا ہے نا۔" ندانے طنزیہ لہجے میں کہا تو وہ فوراً بولی۔

"نہیں..... انہوں نے مجھ سے اس واقعے کے متعلق کبھی کچھ نہیں پوچھا۔ وہ بہت نقیس اور عظیم انسان ہیں۔ انہوں نے مجھ سے اپنے بزنس کے متعلق بھی کوئی بات نہیں کی۔ وہ تو مجھے سب کچھ بھول جانے کے لئے کہتے ہیں۔ اُن کے متعلق تم ایسی فضول باتیں نہ ہی کرو تو اچھا ہے اس ایک واقعے نے کس طرح تمہاری ذہنی پستی کو سامنے لا کر دکھایا ہے۔ افسوس حد افسوس۔"

"تمہیں اتنا اچھا رشتہ نہ ملتا تب پہ چلا کہ زندگی کیسے گزرتی ہے۔"

"مس عدا! آپ کے بھائی آپ کو لینے آئے ہیں۔ جاییے۔" اسی وقت انیس ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے اس کی طرف دیکھ کر سنجیدہ لہجے میں کہا وہ ان دونوں کی ساری گفتگو سن چکا تھا۔

"اوہ انیس بھائی آپ کیسے ہیں؟" ندانے شیطا کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کم از کم میں ویسا نہیں ہوں جیسا آپ مجھے سمجھتی ہیں۔ میں بیوی کو اپنے دل اور گھر میں رکھنے کا قائل ہوں عدا بی بی۔ اُسے بزنس کی ترقی کا زینہ بنانے والوں میں سے نہیں ہوں اور الحمد للہ ہمارا بزنس پہلے ہی بہت ترقی کر چکا ہے، میں ایسی گھٹیا حرکتیں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں ایک بات اور۔" انیس نے اس کے شرم سے زرد ہوتے چہرے کو دیکھتے ہوئے بارعہ لہجے میں کہا۔

"آئندہ اپنے دل و دماغ سے منفی سوچوں کو نکال کر اپنی بہن کے گھر تشریف لائیے گا۔ اس سے حسد کرنے کی بجائے اپنی سٹیجی سوچ کو صحیح کرنے کی پاکیزہ اور مثبت بنانے کی کوشش کیجئے گا۔ شا ایک با حیا اور با کردار لڑکی ہے اس کے کردار پر کچھ اچھالنے سے بہتر ہے کہ آپ اپنے کردار و گفتار پر غور کریں۔ سگی بہن ہو کر آپ کے یہ خیالات ہیں اپنی بہن کے لئے بہت افسوس کی بات ہے۔"

"آئی ایم سوری اللہ حافظ۔" ندانے شرمندگی سے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

"لندن..... ہم لندن چلے جائیں گے پاپا مجھے وہاں بزنس کی دیکھ بھال کے لئے بھیجنا چاہ رہے تھے تب مجلس بھائی نے وہاں کا آفس سنبھال رکھا تھا۔ وہ اب اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان آگئے ہیں تو میں تمہیں لے کر وہاں شفٹ ہو جاؤں گا اور اس طرح تم بھی ان کم ظرف لوگوں کی باتوں کے نشتر سے محفوظ رہو گی۔" انیس نے سنجیدگی سے بتایا تو وہ اسے پیار سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"آپ کیوں میرے لئے یہ سب کرنا چاہ رہے ہیں آپ اتنے اچھے کیوں ہیں؟"

”میں کہاں اچھا ہوں ڈارلنگ! میں تو بہت گناہ گار اور خطا کار انسان ہوں۔ بس تمہاری معصومیت اور محبت نے بہت پہلے مجھے بے بس کر کے رکھ دیا تھا۔“ وہ ذرا سا مسکرا کر بولا تو اس نے نئی میں سر ہلاتے ہوئے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ خود کو گناہ گار کیوں کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ آپ نے کبھی کوئی چوٹی بھی ماری ہوگی۔“

”ہاں چوٹی تو نہیں ایک تھلی میرے ہاتھوں میں دم توڑ گئی تھی۔“ انیس نے گہری سانس لے کر کہا تو وہ اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔

ان دونوں کے لندن جانے کے تمام انتظامات مکمل ہو گئے تھے اور انیس نے جانے سے پہلے بیگم آسیہ نقیس احمد یعنی اپنی ماما کو اپنے باپ بننے کی خبر سنا کر نہال کر دیا تھا اور انہوں نے اسے بہت ساری ہدایات دی تھیں۔

”انیس بیٹا! ثنا کا ہر طرح کا خیال رکھنا۔ اسے پریشان اور تھامت کرنا۔“

”اوکے ماما اور ثنا سے بھی کہئے کہ یہ میرا بہت سارا خیال رکھے وہاں۔“ وہ مسکراتے ہوئے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ثنا شرمیلے پن سے مسکرا رہی تھی۔

”تم دونوں ہی ایک دوسرے کا خیال رکھنا۔ ثنا بیٹا ڈرنا مت انیس تم سے بہت پیار کرتا ہے جانتی ہو تمہارے والدین کے رشتے سے انکار کے صدمے نے انیس کو بیمار کر دیا تھا اور پھر جس روز اس نے تمہیں ہسپتال میں سے جاتے دیکھا تھا گھر آتے ہی میری منت سماجت کرنے لگا کہ ماما ثنا کو میرے لئے مانگ لیں ورنہ اس کے گھر والے اسے مار دیں گے اور میں مرجاؤں گا۔ یہ تو دیوانہ ہے تمہارا۔“ بیگم آسیہ نقیس احمد اس پر اغمشاطات کر کے اسے حیران اور شاداں کر رہی تھیں۔ وہ بہت چاہت سے انیس کو دیکھ رہی تھی۔

”ماما! آپ میرے سارے سیکرٹ آؤٹ کر رہی ہیں۔ دیکھ لیجئے گا یہ وہاں جا کر خڑے دکھائے گی سر چڑھ جائے گی۔“ انیس نے معنوی خفگی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس ہنسی سے انیس کی روح میں جیسے قوس قزح آگئی ہو۔ اس نے بہت چاہت سے ثنا کو دیکھا تھا۔

سب سے مل کر وہ دونوں لندن کے لئے پرواز کر گئے۔ ثنا کے میکے والوں نے اس کے لندن جانے پر کلمہ شکر ادا کیا تھا کہ اب لوگوں کی باتیں خود بخود دم توڑ دیں گی۔

رات کا تیسرا پہر تھا۔ ثنا کی اچانک آنکھ کھلی تھی اور اس نے انیس کو آج پھر اپنی جگہ سے غائب پایا تھا۔ ایسا اکثر ہوا تھا کہ انیس بستر سے غائب ہوتا تھا وہ اس کو ڈھونڈنے نکلتی تو وہ دوسرے کمرے میں جائے نماز پر رکوع و سجود میں تسبیح و مناجات میں مشغول دکھائی دیتا۔ وہ پانچ وقت باقاعدگی سے نماز ادا کرتا تھا اور تہجد بھی پڑھتا۔ اس کی آنکھیں رات کے اس پہر بھیگتی، جھلکتی رہتی تھیں۔ وہ اتنا کیوں روتا ہے یہ بات ثنا کی سمجھ میں آج تک نہیں آئی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنی جگہ پر آکر لیٹ جاتی تھی لیکن آج اس نے اس سے پوچھنے کا تہیہ کر لیا تھا سو اس کے نماز و دعا سے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ جائے نماز رکھ کر واپس پلٹا تو اسے دروازے میں کھڑا دیکھ کر ٹھٹھک گیا اور اس کے پاس آتے ہوئے استفسار کرنے لگا۔

”تم..... کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری کیوں چلی آئیں؟“

”ایک بات پوچھوں.....؟“ ثنا نے اس کی بھیگی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”پوچھو.....“

”آپ اس وقت عبادت کیوں کرتے ہیں؟“

”اس وقت عبادت کا ثواب سب سے زیادہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ساتویں آسمان پر آکر اپنے بندوں کی دعائیں، التجائیں اور فریادیں سنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کوئی ہے جو مجھ سے مانگے اور میں اس کا دامن بھردوں۔ کوئی ہے جو بخشش کا طلب گار ہو میں اسے بخش دوں معاف کر دوں۔“ انیس نے بھاری لہجے میں نرمی سے جواب دیا۔

”وہ تو میں جانتی ہوں لیکن آپ اتنا روتے کیوں ہیں؟“

”اس کو آنسو بہت پسند ہیں نا اس لئے، اور اس کی نعمتوں کے شکر کے لئے اپنی خطاؤں کی بخشش کے لئے اور اس نے مجھے تم سے ملا دیا اس کا شکر تو میں تمام عمر سجدے کر کے ادا کرتا رہوں تب بھی نہ ادا کر پاؤں گا تمہاری محبت کا شکر یہ بھی تو ادا کرنا تھا آج کے آنسو اس لئے بہے تھے کہ انیس احمد تمہاری محبت پا کر مالا مال ہو گیا ہے۔ شکر کرنے سے نعمت بڑھتی ہے اور میں تمہاری محبت کی نعمت بڑھتے ہوئے دیکھتے رہنا چاہتا ہوں زندگی کی آخری سانس تک تمہارا پیارا چاہتا ہوں اس لئے شکر ادا کرتا رہتا ہوں معافی مانگتا رہتا ہوں۔“ انیس نے اس کے چہرے کو ہاتھوں میں تھام کر مسکراتے ہوئے جواب دیا تو وہ اس کے جذباتوں کی شدتوں پر ششدرہ گئی۔ اس کی دیوانگی پر سہم سی گئی۔

”انیس!“ وہ اس کے سینے سے لپٹ کر رونے لگی۔

”نہیں، رونا نہیں، تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا نا ادھر دیکھو۔“ وہ پیار سے بولا۔

”آپ بھی تو رو رہے ہیں۔“ اس نے سراٹھا کر اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو چپ کراؤ تا یا تم میرے آنسو پونچھ لو اور میں تمہارے آنسو پونچھ لیتا ہوں۔“ وہ بھیکتی آواز میں بولا تو وہ روتے روتے ہنس پڑی اور دونوں نے ایک دوسرے کے آنسو اپنے ہاتھوں میں جذب کر لئے۔

انہیں کی پُر خلوص اور پُر جوش محبتوں میں وقت اتنی تیزی سے گزرا تھا کہ اُسے پتہ ہی نہیں چلا تھا اور اس کی ڈیوری کا دن بھی آگیا۔ انہیں پریشان سالنڈن کے ایک معروف ہسپتال میں آپریشن تھیٹر کے باہر کھڑا تھا۔ ثنا کی طبیعت کافی خراب تھی وہ اس وقت اس صدمے سے رو رہی تھی۔ وہ بار بار انہیں سے کہہ رہی تھی کہ میں اس بچے کو نہیں پالوں گی۔ اس کی صورت بھی نہیں دیکھوں گی اور انہیں نے بمشکل اُسے چپ کرایا تھا۔ وہ اس کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہا تھا۔ اس کی بگڑتی حالت دیکھ کر اسے بچے سے زیادہ ثنا کی سلامتی کی فکر تھی۔ اب ایک گھنٹے بعد انگریز نرس نے اسے باپ بننے کی نوید سنائی۔ ثنا نے ایک صحت مند بچے کو جنم دیا تھا۔ ڈیوری نارمل ہوئی تھی۔ یہ سنتے ہی انہیں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ بچے کو نرسری میں شفٹ کر دیا گیا تھا آدھے گھنٹے کے لئے، اور ثنا کو ریکوری روم میں پہنچا دیا گیا تھا۔ انہیں بچے کو دیکھنے گیا تو حیران رہ گیا۔ وہ بچہ ہو بہو اُن دونوں کا عکس تھا۔ گول منول سرخ و سفید رنگت، سیاہ بال نین نقش بھی ثنا اور انہیں کے چرائے تھے اُس نے۔ وہ بچے کو دیکھ کر دیر تک مسکراتا رہا پھر اُسے پیار کر کے نرسری سے باہر آیا تو نرس نے آکر اسے اطلاع دی۔

”آپ کی سز مسلسل رو رہی ہیں۔ انہیں جا کر سنبھالیں ورنہ ان کی حالت بگڑ جائے گی۔“ ”اوہ نو۔۔۔۔۔“ انہیں پریشان ہو کر ثنا کے کمرے میں آیا وہ بیڈ کی پشت سے تکیہ لگائے نیم دراز تھی اور رو کر اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھی۔ انہیں نے دیکھا تو تڑپ کر اس کے قریب چلا آیا۔ ”ثنا! یہ کیا کر رہی ہو تم کیوں اپنی جان ہلکان کر رہی ہو اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں خیریت سے اس مرحلے سے گزار دیا اور تمہاری آغوش میں متنا کا بھول کھلا دیا ہے۔“ وہ اس کے قریب بیٹھ کر اس کا ہاتھ تمام کرنزی سے سے بولا۔

”وہ۔۔۔۔۔ بھول نہیں ہے۔۔۔۔۔ بول ہے۔۔۔۔۔ جو ساری زندگی میرے دل میں چھبھتا رہے گا۔“ ”نہیں ثنا! تم کیوں اس معصوم سے متنفر ہو رہی ہو۔“ وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے نرمی سے بولا۔

”اس لئے کہ وہ ایک شیطان کی اولاد ہے جس نے میری عزت کا آئینہ تار تار کیا تھا۔“

میں اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ اس کے بچے کو نہیں پالوں گی۔۔۔۔۔ اس کی۔۔۔۔۔ شکل بھی نہیں دیکھوں گی۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔“ وہ روتے روتے ہچکیاں لینے لگی۔ انہیں کی بے چینی دے قراری میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ اسے اپنی بانہوں میں لے کر نرمی اور محبت سے گویا ہوا۔

”ثنا میری جان! سنبھالو خود کو پرسکون ہو کر سوچو ثنا، تمہارے لہو نے اس کے وجود کو سینچا ہے وہ تمہارے وجود کا حصہ ہے ثنا تمہارا رنگ روپ لے کر پیدا ہوا ہے کیا تم اسے اپنی آغوش سے جدا کر کے چین سے جی سکو گی؟ جسے اس دنیا میں لانے کے لئے تم نے اتنی تکلیف جھیلی ہے کیا اسے اپنی ممتا سے محروم کر کے خوش رہ سکو گی؟ ثنا تم نے اسے جنم دیا ہے تم ماں ہو اس معصوم کی کسی غیر کے حوالے کر دو گی اپنے بچے کو۔“

”!۔۔۔۔۔ انہیں۔۔۔۔۔ انہیں“ ثنا کا روتے روتے سانس اکھڑنے لگا تھا۔ انہیں کی باتیں اس کی سمجھ میں تو آرہی تھیں لیکن اس کی حالت بگڑ گئی تھی۔

”ثنا! کیا ہوا ثنا؟ ڈاکٹر نرس۔“ انہیں نے پریشان ہو کر پکارا اور بیڈ کی سائیڈ پر لگی ہوئی بزر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ثنا تمہیں میرے لئے جینا ہے اپنے بچے کے لئے جینا ہے تمہیں میری قسم مجھے چھوڑ کے مت جانا ورنہ میں بھی یہ دنیا چھوڑ دوں گا۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اور تمہارا بیٹا اکیلا رہ جائے گا۔ ثنا میری خاطر خود کو سنبھالو پلیز یا اللہ رحم کر میں بہت گناہ گار ہوں مانتا ہوں کہ میں بہت خطا کار ہوں لیکن یہ سزا مجھے مت دینا۔۔۔۔۔ میری ثنا کو مجھ سے جدا مت کرنا۔“

انہیں اس کا سراپے بازو پر رکھے کبھی اسے مخاطب کر رہا تھا اور کبھی ربت سے فریاد کر رہا تھا۔ اتنے میں ڈاکٹر اور نرس کمرے میں داخل ہوئے۔ ثنا منہ کھول کر سانس لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے انہیں کا گریبان اپنی مٹھی میں بھینچ رکھا تھا۔ ڈاکٹر نے ثنا کو فوراً آکسیجن لگا دی اور نرس سے اسے آئی سی یو میں شفٹ کرنے کا کہا۔ انہیں اپنا دل تمام کر رہ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی محبت ریت کی طرح اس کے ہاتھوں سے پھسلتی جا رہی ہے۔ وہ اسی کمرے میں بستر کے کنارے کا سہارا لیتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

”پریشان مت ہوں۔ خدا بہتر کرے گا۔“ نرس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی تو وہ اپنی آستینوں سے اپنے چہرے کو صاف کرتا ہوا باہر آگیا۔ ایک گھنٹے بعد ثنا کی حالت سنبھل گئی۔ اس کے منہ سے آکسیجن ماسک ہٹا دیا گیا تھا۔ ثنا نے آنکھیں کھولیں تو انہیں کا انگلیاں چہرہ اس کی نگاہوں کے عین سامنے تھا۔ وہ دیوار سے لگا کھڑا اُسی کو تنگ رہا تھا۔ اس کے ہوش میں

آنے پر اس کی روح کو بھی قرار آ گیا۔

”یہ پیارا انسان میرے سارے زخم اپنی محبت سے بھرتا رہا ہے اب تک میرے نام سے منسوب ساری ذلت و رسوائی اس نے اپنے نام کر لی مجھے اپنا نام دیا، مقام اور احترام دیا۔ بچے کو اپنے نام کی پہچان دے رہا ہے اور میں..... میں کتنی ناشکری خود غرض و بے حس ہوں انہیں کو شروع دن سے ہرٹ کرتی آرہی ہوں۔ میرے اللہ مجھے معاف کر دے میں اپنے بچے کو اپنے سینے سے ضرور لگاؤں گی۔“ ثناء نے دل میں کہا۔ انہیں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور ہونٹوں سے لگا لیا۔ وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ اس کی اس حالت نے اس کی جان پر بتا دی تھی۔

”سوری انہیں.....“ وہ آہستگی سے بولی۔

”ثناء! آئی لو یو ثنا۔“ اس نے روتے روتے اپنی پیشانی اس کے شانے پر رکھ دی۔ ثناء نے آہستگی سے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے سر پر رکھتے ہوئے بھیکتے لہجے میں کہا۔

”آئی لو یو اینڈ آئی ایم سوری۔“

نرس نے ثنا کو بتایا کہ وہ اس کے آئی سی یو میں جانے کے بعد بچوں کی طرح مٹھوٹ مٹھوٹ کر دیا تھا۔ ثنا تو اس کی محبتوں کی مقروض ہو گئی تھی۔ اتنی محبت، اتنی چاہت، اتنا پیار انہیں نے اس کے جیون میں بھر دیا تھا کہ اس کا دامن تنگ پڑ گیا۔ وہ اس سے بہت شرمندہ تھی۔

”انہیں ہمارا بیٹا کہاں ہے؟“ اس نے مدھم اور پر نرم آواز میں پوچھا تو انہیں نے فوراً سر اٹھا کر اس کے چہرے کو دیکھا۔

”ثناء! تم..... تم دیکھو گی اُسے، پیار کرو گی نا اسے۔“ انہیں خوشی سے بھیگی ہوئی آواز میں پوچھ رہا تھا تو اس نے مسکراتے ہوئے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تھینک یو ثنا! میں ابھی اُسے لے کر آتا ہوں۔“ وہ خوشی سے اس کا ہاتھ پھوم کر بولا اور بچے کو لینے چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ سفید کمر میں اپنے سرخ و سفید نومولود کو لئے اس کے پاس آ بیٹھا۔ ثناء نے بچے کو دیکھنے کے لئے اٹھنا چاہا تو انہیں نے اسے بازو سے سہارا دے کر احتیاط سے بٹھا دیا۔ ثناء نے اپنی سانسیں نارل ہونے پر بچے کو اپنی گود میں لینے کے لئے اپنی بانہیں انہیں کے سامنے پھیلا دیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے بچے کو اس کی بانہوں کے پالنے میں لٹا دیا۔ بچے نے کسمسا کر آنکھیں کھولیں تو ثنا کے لب مسکرا دیئے۔ اس نے ٹھک کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تو وہ رونے لگا۔ اُسے بھوک ستا رہی تھی۔ ثناء نے اپنے سینے سے لگا کر ڈھیروں پیار کیا۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔ انہیں بہت محبت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ثنا اس وقت اسے

صرف ایک ماں دکھائی دے رہی تھی۔ متا کی محبت سے بھر پور ماں۔

”انہیں! یہ تو ہم دونوں کی شہیدہ ہے۔“ اس نے انہیں کو دیکھ کر کہا۔

”ہاں کیونکہ تم اس کی ماں ہو اور بچے کی ماں جو چہرہ سب سے زیادہ اپنی لگا ہوں کے سامنے دیکھتی ہے یاد رکھنا چاہتی ہے سنا ہے کہ اس کے بچے میں اسی چہرے کا عکس شامل ہو جاتا ہے اس لئے یہ میرا ہم شکل بھی ہے کیونکہ تم نے پورے 9 ماہ یہی چاند چہرہ دیکھا ہے نا۔“ انہیں نے مسکراتے ہوئے اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”ہاں!“ وہ ہنس پڑی تو جیسے انہیں کے اندر اطمینان کے جزیرے پھر سے آباد ہونے لگے۔ بچہ رو رہا تھا۔ انہیں نے اٹھتے ہوئے اس سے کہا۔

”اُسے بھوک لگ رہی ہے تم اسے فیڈ کراؤ میں ڈاکٹر سے مل کر آتا ہوں۔“ انہیں کے جانے کے بعد اس نے بچے کو دودھ پلایا اور ڈھیر سارا پیار کیا۔

تیسرے دن وہ احد کو لے کر گھر آ گئی تھی۔ بچے کا نام انہیں کے علاوہ نفیس احمد نے بھی احد تجویز کیا تھا۔ ثنا کے میکے اور سسرال میں ثنا کے ہاں بیٹا پیدا ہونے کی خبر بہت خوشی سے سنی گئی تھی۔ انہیں نے بچے کی تصاویر کھینچ کر بھجوائی تھیں پاکستان۔ بیگم آسیہ نفیس احمد تو پوتے کو دیکھنے اور بہو سے ملنے لندن چلی آئی تھیں اور پورے چار ماہ رہ کر واپس پاکستان آ گئی تھیں۔

”ہم لندن چلے جائیں گے۔ وہاں صرف ہم ہوں گے میں محبت اور تم اور کوئی نہیں ہو گا۔“ انہیں کی بہت پہلے کہی گئی بات اسے یاد آرہی تھی۔ اس نے اپنا کھانچ کر دکھایا تھا۔ ان دونوں کے بیچ محبت ہی محبت تھی بس۔ انہیں کی محبت میں گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ثنا کو بھی اس سے بل بھر کی جذباتی محال لگنے لگتی تھی۔ وہ آفس میں ہوتا تو دن میں کئی بار گھر فون کر کے اس سے بات کرتا تھا۔ وہ اس کی محبت میں کم ہو کر اپنے سارے دکھ بھول گئی تھی۔ اس کا گھر جنت کا نمونہ تھا۔

”میں محبت اور تم

اک لڑی میں ایسے کم۔

جیسے سیپ میں موتی کی چھب جیسے پھول میں خوشبو کا ڈھب۔

دونوں کو اک دوجے سے کون جدا کر سکتا ہے اب۔“

☆☆☆

انہیں لندن آئے تقریباً تین سال ہونے والے تھے۔ وہ اس دوران پاکستان نہیں گئے

تھے البتہ دعا کی شادی چند ماہ پہلے ہو گئی تھی۔ بیگم آسیہ نفیس اور نفیس احمد دو تین بار ان سے اور اپنے پوتے سے ملنے آچکے تھے۔ اب تو ثنا کا دل بھی پاکستان واپس جانے کو بے چین رہنے لگا تھا۔ انیس بھی وطن واپس جانا چاہتا تھا لیکن ثنا کی وجہ سے اس سے اپنی خواہش کا اظہار کرنے سے قاصر تھا۔ لندن میں اس نے بہت عرصہ سے بزنس سنبھالا تھا اور ہر کام کے لئے ورکرز بھی ٹرینڈ کر دیئے تھے۔ زیر ہمدانی کو وہ اپنی جگہ آفس میں چھوڑ کر جانا چاہتا تھا۔

بارش فرسٹ گل مسلسل ناچ رہی تھی۔ ہوا کی لے بے حد شوخ تھی پٹر خوشی سے ٹھوم رہے تھے۔ ساری فضا بچوں کی ہنسی سے گونج رہی تھی اور وہ اُداسی کی چادر اوڑھے بیٹھا تھا اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ آج ان دونوں کی شادی کو پورے تین برس ہو گئے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے ثنا کو شادی کی سالگرہ کا تحفہ دیا تھا۔ اسے ڈھیر سارا پیار کیا سالگرہ کا ایک اس کے ساتھ مل کر کاٹا تھا۔ اسے اپنے ہاتھ سے کھلایا تھا اور پھر اس سے کافی کی فرمائش کی تھی۔ ثنا کافی بنا کر لے آئی تھی مگر انیس کی اداسی نے اسے بھی پریشان کر دیا تھا۔ اس نے کافی کے دونوں گک میز پر رکھ دیئے۔

”انیس!“ جیسے ثنا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیئے۔

”ہوں.....“ اس نے چونک کر دیکھا۔

”کیا کوئی پریشانی ہے آپ کو؟“

”کوئی نہیں۔“ وہ مسکرا دیا۔

”کوئی پریشانی، کوئی دکھ، کوئی غم، کوئی پچھتاوا کچھ تو ہے انیس جو آپ کو ہر خوشی کے موقع پر ایک دم سے اُداس اور بے چین کر دیتا ہے۔ تین سال ہو گئے ہیں آج ہماری شادی کو اور ان تین سالوں میں میں نے بارہا آپ کو اٹک بھاتے رب کے حضور گڑ گڑاتے دیکھا ہے۔ ایسا کون سا دکھ ہے آپ کو اتنا رونے کے بعد بھی جو کم نہیں ہوتا۔ بتائیے ناں انیس..... آپ مجھ سے شیر کیوں نہیں کرتے کیا مجھے اس قابل نہیں سمجھتے؟“

وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے سنجیدہ مگر اپنائیت بھرے نرم لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

”نہیں جان! میں تو خود کو تمہارے قابل نہیں سمجھتا۔“

”ایسا مت کہئے میرے لئے اس پوری کائنات میں آپ سے اچھا، قابل، پیارا اور قابل محبت کوئی دوسرا شخص نہیں ہے انیس۔ آپ نے مجھے اس وقت سہارا دیا تھا جب سارے سہارے مجھ سے چھن گئے تھے۔ مجھے اس وقت اپنا سب اپنے غیر بن گئے تھے۔ آپ نے تو مجھے نئی زندگی دی تھی انیس! آپ نے مجھے پھر سے معتبر اور معزز بنایا ہے۔ میرے انیس جیسا عظیم انسان تو

اس پوری کائنات میں بھی نہیں ہوگا۔“ وہ اس کے ہاتھ تھام کر نیچے گھٹنوں کے بل بیٹھی اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے دل سے اعتراف کر رہی تھی اور وہ خوشی سے رُو ہی تو پڑا تھا۔

”ثنا! تم نے مجھے اس قدر محبت اور چاہت دی ہے کہ اب اگر تم نے کبھی اپنی محبت سے دور یا محروم رکھا تو جی کہتا ہوں میرا دل بند ہو جائیگا۔“

”اللہ نہ کرے۔“ وہ تڑپ کر اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”ہاں ثنا! میں تو پہلے ہی تمہارے بغیر زندگی گزارنے کا تصور کر کے مرنے لگتا تھا اور اب تو میرا روم روم تمہاری محبت کے بل پر زندہ ہے۔ مہک رہا ہے، مجھے خود سے کبھی جدا نہ کرنا تھا ورنہ موت مجھ سے آٹے گی۔“

”انیس! خدا کے لئے مجھ سے مرنے کی باتیں مت کریں ورنہ میں رونے لگوں گی۔ میں اتنی بہادر نہیں ہوں کہ آپ کی جدائی کا غم سہہ لوں۔ آئندہ اگر آپ نے ایسی بات کی تو.....“ وہ بولتے بولتے رو پڑی۔

”آئی ایم سوری میری جان رنلی سوری۔ اُٹھو میرے پاس بیٹھو آؤ ناں۔“ انیس اسے روتا دیکھ کر بے قرار ہو گیا اور بازوؤں میں پکڑ کر اٹھایا اور پورے استحقاق کے ساتھ اپنی آغوش میں سولیا۔ وہ رو رہی تھی اور وہ اس کے آنسو پونچھ رہا تھا۔

”آپ کو..... میری محبت پر اعتبار نہیں ہے نا..... جیسی تو ایسی باتیں کر کے میرے دل کو تڑپاتے اور آزماتے رہتے ہیں۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”بھئی! میں تمہیں تڑپانے، آزمانے یا رلانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم تو سراپا محبت ہو میں اپنی خوش بختی پر جتنا ناز کروں وہ کم ہے۔ پتہ نہیں کبھی کبھی مجھے کیا ہو جاتا ہے۔“ وہ اس کے سر پر بوسہ دے کر پیار سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”ایک بات کہوں؟“ وہ خود کو سنبھال چکی تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھا جو اس کے چہرے سے مس ہو رہا تھا۔ دھڑکنیں دھڑکنوں سے ٹکرائی تھیں۔ وہ اُن کے قرب کی خوشبو میں مہک رہی تھی۔

”ہاں کہو.....“ اس نے بہت پیار سے کہا۔

”گھر واپس چلیں۔“

”ہم گھر میں ہی ہیں۔“ وہ اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔

”میرا مطلب ہے پاکستان واپس چلیں۔ مجھے اپنا وطن اپنا گھر اور سب گھر والے بہت

یاد آتے ہیں۔“ ثنا نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”یادلو جیسے ہی بہت آتے ہیں۔“

”تو پھر چلیں نا اس بار بڑی عید ہم وہاں سب کے ساتھ منائیں گے اور آپ کی سالگرہ بھی، میرا اب یہاں رہنے کو دل نہیں چاہتا۔“

”تم نے میرے دل کی بات کہہ دی تھیں بھی بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے بات کروں مگر میں یہ سوچ کر خاموش رہ گیا کہ شاید تم جانا نہ چاہو اور میری وجہ سے زبردستی ہاں کر دو تو یہ زیادتی ہوگی تمہارے ساتھ لیکن اب تم نے خود سے کہا ہے تو میں بہت خوش ہوا ہوں۔ انشاء اللہ ہم بہت جلد پاکستان واپس چلے جائیں گے اور عید الاضحیٰ سب کے ساتھ مل کر منائیں گے۔“ وہ مسکراتے ہوئے اس کے مسکتے وجود کی نرم ہاتھوں کو محسوس کرتے ہوئے بولا، اور پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر بولا۔

”ٹھا اگر تمہیں میرے بغیر جینا پڑے تو.....“

”تو جی نہیں سکوں گی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیوں کہا آپ نے ایسا، یہ کیا ہو جاتا ہے اچانک آپ کو؟“ ٹھا نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”ٹھا! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“

”کہئے.....“ وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔

”ٹھا میرا جرم، میرا گناہ بہت بڑا ہے اس لئے وعدہ کرو کہ تم مجھے معاف کر دو گی۔“ وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں اس احساسِ جرم کے ساتھ مزید نہیں جی سکوں گا کیونکہ میں اپنی ہی نظروں میں گر چکا ہوں۔ اٹھنا بھی چاہوں تو نہیں اٹھ سکتا لیکن..... شاید تمہارے معاف کر دینے سے میرے احساسِ جرم میں کچھ کمی ہو جائے۔“

”ایسا کیا کیا ہے آپ نے؟“ ٹھا نے حیرانگی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”پہلے وعدہ کرو کہ تم مجھے معاف کر دو گی۔ مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گی۔ مجھے اپنی محبت سے کبھی محروم نہیں کر دو گی۔“ وہ اس کے ہاتھ تھامے بے قراری سے بولا۔

”آپ بتائیے تو کیا کیا ہے آپ نے؟“ اس کی حالت محال ہو رہی تھی۔

”میں نے وہ سب کیا جس کی بدولت تم اپنے گھر اور شہر بھر میں بدنام اور رسوا ہوئیں اور بحالتِ مجبوری میرے نکاح میں دے دی گئیں۔“ انیس نے نظریں جھکا کر یہ انکشاف کرتے ہوئے بتایا۔

”کیا.....؟“ ٹھا کی سماعتوں میں تو جیسے ایٹم بم پھٹ گیا تھا۔

”ہاں..... اُحد میرا ہی خون ہے۔ میں ہی وہ بے غیرت ہوں جس نے تمہارے ساتھ.....“

”بس کیجئے پلیز!“ وہ چیخ اٹھی جھٹکے سے اپنے ہاتھ بھی اس کے ہاتھوں سے چھڑائے۔

”ٹھا!“ انیس نے تڑپ کر پکارا۔

”کچھ مت کہئے انیس احمد!“ وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

”بے شک تم مجھے جان سے مار دو مگر مجھے میرے جیتے جی چھوڑ کر مت جانا۔ میں بہت

بے بس ہو گیا تھا تمہارے گھر والوں کے انکار نے مجھے تار تار کر دیا تھا ٹھا۔“ وہ روتے ہوئے بولا۔

”اور آپ نے مجھے تار تار کر دیا انیس احمد مجھے..... اپنی محبت کو۔“ وہ روتے ہوئے بولی

انیس نے کچھ کہنا چاہا مگر وہ روتی ہوئی دوسرے کمرے میں بھاگ گئی اور بستر پر گرتے ہی مٹھوٹ

مٹھوٹ کر رونے لگی۔

”یا اللہ! یہ تو نے کیسی تقدیر لکھی ہے میری مانگ میں راکھ ڈالنے اور میرا آنچل تار تار

کرنے والے ہاتھوں نے میری مانگ افشاں سے بھر دی اور آنچل ستاروں سے ٹانگ دیا۔ ذلت و

رسوائی کا سبب بننے والے انیس احمد کو میری محبت اور پذیرائی کا باعث بنا دیا۔ کیا سزا دوں میں انیس

احمد کو اس گناہ کی جو وہ خود تین سال سے اس احساسِ گناہ میں گھرے تیرے دربار میں اشکوں کے

موتی لٹاتے رہے ہیں۔ میں تین ہفتے جس کرب سے گزری تھی انیس احمد تین سال اور تین ماہ سے

اس کرب کو جھیل رہے ہیں۔ ان کا ضمیر انہیں چین نہیں لینے دیتا اور ضمیر کا زہر تو سقراط کے پیا۔

سے بھی بڑا ہوتا ہے..... اس واقعے کے بعد میرے سگے رشتے سوتیلے بن گئے تھے۔ اپنے پرانے

گمے تھے۔ ماں باپ، بہن بھائی، بھائیاں رشتے دار دوست سب ہی کی نگاہوں میں میرے

حقارت اور تمسخر بھر گیا تھا۔ سب کی باتوں، لہجوں اور رویوں نے میری روح کو چھلنی کر دیا تھا۔ سارے

مجھ سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مجھے مار دینا چاہتے تھے اور سارے خون کے رشتے خ

رشتوں میں بدل گئے تھے۔ میرے کردار کو سب نے غلط جانا تھا اور یہ سب انیس احمد کے غلط اقد

سے ہوا تھا۔ ایک گناہ، ایک جرم جو یقیناً ناقابلِ معافی ہے لیکن..... انیس احمد بھی تو انسان

فرشتے تو نہیں ہیں کہ ان سے کوئی غلطی، کوئی گناہ، کوئی خطا سرزد نہ ہو سکے۔ یہ گناہ، یہ جرم ان

نے مجھے پانے کے لئے کیا تھا۔ ان کی محبت اتنی خطرناک تھی کہ وہ مجھے، خیر جو گزر گیا اس پر کیا ر

سزا تو میں تب انیس احمد کو دوں کہ انہوں نے مجھے بے آبرو کر کے بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہو۔ ان

نے اپنے جرم کا اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے، اس زیادتی کی تلافی کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

ان تین برسوں میں انیس نے مجھے اتنی محبتیں دی ہیں کہ میری تین زندگیوں کے

بہت ہوں گی..... انیس نے مجھ سے بہت دھوم دھام سے شادی کی۔ اُحد کو اسی لئے اپنا نام

رہی تھی۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی حالت پر تڑپ رہے تھے۔
 ”تم نے کہا تھا نا ثنا کہ اگر وہ شخص تمہارے سامنے آگیا تو تم اسے گولی مار دو گی ختم کر دو گی..... وہ شخص تمہارے سامنے ہے نا لو اُسے گولی مار دو، ختم کر دو اپنی عزت کے دشمن کو۔“
 پستول لئے انیس نے بھیکتی آواز میں کہا تو چند سیکنڈ وہ اسے دیکھتی رہی پھر آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر پستول اٹھا لیا اور بستر سے اتر آئی۔

”یہ شخص تو میری عزت کا دشمن ہرگز نہیں ہے اس شخص کی وجہ سے میرے میکے والے اب مجھے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ ان کے سامنے بچھ بچھ جاتے ہیں۔“ ثنا نے دل میں کہا اور پستول میں سے گولیاں نکال کر ڈسٹ بن میں پھینک دیں۔ پستول اس کے ہاتھوں سے پھسل کر نیچے جا گرا۔
 ”ختم کر دوں اپنا سب کچھ ختم کر دوں۔“ وہ اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”آپ دنیا والوں کی نظروں میں ایک عظیم انسان ہیں۔ میرا سہاگ ہیں میرے بچوں کے باپ ہیں..... اور..... اور میری محبت بھی تو ہیں میں..... میں کیسے مار دوں آپ کو انیس احمد کیسے؟ میں پھر سے رسوائیوں کے بھنور میں نہیں پھنسا چاہتی۔ آپ کو مار کر مجھے کیا ملے گا؟ ذلت، رسوائی جیل اور جگ ہنسائی..... میرا بچہ زل جائے گا۔ پہلے کیا کم رسوائی ہوئی تھی میری کہ اب میں شوہر کو قتل کر کے پھر سے ذلت کا اشتہار بن جاؤں۔ نہیں انیس احمد میری بے گناہی اور پارسائی پر تو پھر بھی کوئی قیامت تک یقین نہیں کرے گا۔ آپ تو تب بھی..... مظلوم..... معصوم اور عظیم ہی کہلائیں گے۔ جائیے انیس احمد میں نے آپ کو معاف کیا۔ اس محبت کے صدقے جو آپ نے مجھے..... ان تین برسوں میں دی ہے۔ اس راحت و مسرت کے صدقے جو آپ مجھے مہیا کرتے رہے ہیں اور..... اور اس اولاد کے صدقے جس کا ہونا آپ کے وجود کے سبب ہے..... میں نے آپ کو اس گناہ کے لئے معاف کیا انیس احمد..... میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی آپ کو معاف کرے۔“ وہ روتے ہوئے اس کے دل پر پہاڑ جتنا بوجھ اٹھاتی اس کے لئے اور بھی اُمول ہو گئی تھی۔

”نا! میں تمہارا قصور وار ہوں..... مجرم ہوں تمہارا مجھ سے بھول ہو گئی تھی ثنا میں بہک گیا تھا۔ شیطان کے بہکاوے میں آگیا تھا۔ میرے دوست فیضان نے میری تمہاری لئے بے قراری دیکھتے ہوئے یہ مشورہ دیا تھا وہ دینی میں ہوتا ہے آج کل اسے معلوم ہے کہ میں نے تم سے شادی کر لی تھی۔“

”تو وہ دوسرا شخص آپ کا دوست تھا۔“ ثنا نے اس کا غامت سے چور چہرہ دیکھتے ہوئے کہا تو نظریں جھکا کر سنجیدگی اور رنجیدگی سے گویا ہوا۔

اور مجھے جنم دینے پر آمادہ کرتے رہے کہ وہ جانتے تھے کہ اُحد اُن کا خون ہے ان کا بچہ ہے، اسے بہر حال انہوں نے جائز اولاد کی صورت میں اس دنیا میں لانے کے لئے مجھ سے نکاح کر لیا تھا ازالہ تو کر دیا تھا اپنے گناہ کا مجھ سے شادی کر کے، بچے کو اپنا نام دے کر۔ میں ان کا یہ جرم کیسے ان کے سامنے رکھوں۔ اب تو وہ خود ہی احساسِ جرم سے اندر ہی اندر گھلتے رہے ہیں۔ ان کا راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اللہ کے حضور گڑ گڑانا اس امر کی گواہی دیتا ہے کہ وہ اپنے کئے پر بہت نادم تھے۔ اتنے برس احساسِ جرم کی آگ میں تہا چپ چاپ جلتے رہے۔ اس ڈر سے مجھے بھی نہ بتایا کہ کہیں میں ان سے نفرت نہ کرنے لگ جاؤں۔ انہیں چھوڑ کر نہ چلی جاؤں۔ یہ سزا تو بڑی تھی ان کے لئے اب میں کیا سزا دوں انیس کو اور کیوں دوں؟

”شادی کے ان تین برسوں میں انیس نے مجھے ایک بار بھی تو نہیں ڈانٹا۔ اتنی محبت دی ہے مجھے کہ میں تو ان کی جُدائی کے تصور سے ہی مرنے لگتی ہوں۔ اتنا زیادہ خیال رکھا ہے میرا کہ مجھے ان سے دوری کا خیال بھی تڑپانے لگتا ہے..... میرے روم روم میں انیس احمد نے اپنی محبت کی حرارت بھردی ہے۔ اتنی محبت کرنے والے جانثار اور کیرنگ انسان کی میں ایک غلطی، ایک گناہ بھی معاف نہیں کر سکتی کیا.....؟ اُن کی زبان سے یہ حقیقت جان کر میرے دل میں ان کے لئے نفرت کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ بالفرض میں انیس کو سزا کے طور پر چھوڑ دوں تو میں کہاں جاؤں گی؟ یہ دنیا والے مجھے نہیں چھوڑیں گے۔ میکے والوں کے رویے پھر سے ناقابلِ برداشت ہو جائیں گے جو کچھ میرے اغواء کے بعد انہوں نے میرے ساتھ کیا تھا۔ اب کی بار اس سے زیادہ نفرت اور ذلت دیں گے مجھے..... انیس احمد کا سلوک اگر مجھ سے بُرا ہوتا تو پھر بھی میں واپسی کا نہیں سوچ سکتی تھی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ انیس احمد کے سوا میری کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ اب بھی میں واپس جانے کا نہیں سوچ سکتی میرے پاس واپسی کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اس اغواء والے واقعے کے بعد جو ذلت، اجنبیت، غیرت..... اور اذیت میں نے سہی تھی۔ اپنی پرائیوٹ سب کی باتوں کے نفرتوں کے نشتر برداشت کئے تھے۔ وہ سب پھر سے جھیلنے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔ انیس کا جرم بے شک بڑا تھا لیکن انہوں نے اس کی عطا کر دی ہے اور کر رہے ہیں اتنی محبت، توجہ اور خیال کے خوبصورت جذبے مجھے سوئپ کر..... وہ..... مادیا اگر نہ دے ہوتے تو مجھے کبھی نہ اپناتے یا کم از کم مجھ سے اعترافِ جرم نہ کرتے مگر وہ ایک اچھے انسان ہیں اور اچھے انسان کو اگر اپنی غلطی کا احساس ہو جائے تو اسے معاف کر دینا چاہیے۔“

ثنا کے دل و دماغ سوچتے سمجھنے کی جانب گامزن تھے۔ رات کی چادر شانوں سے سرکتی جا

”ہاں میں کمزور لمحے کی گرفت میں آ گیا تھا اور ہستی میں جاگرا تھا مگر یہ سچ ہے کہ میں نے تمہیں پانے کے لئے وہ سب کیا تھا۔ میرے پاس اور کوئی راستہ ہی نہیں بچا تھا..... ٹا اگر تم میری زندگی میں نہ آتی تو مر جاتا۔ تمہاری محبت کی شدت نے مجھے اس حد تک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں اپنے کئے پر بہت نادم ہوں۔ ٹا ان تین برسوں میں میںیں پل بل مرا ہوں، احساسِ گناہ نے مجھے چین نہیں لینے دیا ٹا تمہاری محبت، قربت اور رفاقت پر جب جب میں نازاں اور شاداں ہوتا مجھے تب تب اپنے اس جرم نے لعن طعن کیا۔ آج میرا ضبط جواب دے گیا تھا ٹا میں مزید تمہیں اندھیرے میں نہیں رکھ سکتا تھا سب سچ سچ بتا دیا ہے۔ اب تم مجھے..... جو چاہو سزا دے لو لیکن جیتنے جی مجھے اپنی جدائی کی سزا مت دینا۔“

”کتنی عجیب بات ہے مجھے آپ سے نفرت نہیں ہو سکی۔ یہ سب جان کر بھی نہیں یا شاید اس لئے کہ آپ نے اپنی محبتوں سے اپنا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ میں نے آپ کو معاف کر دیا ہے انہیں اب آپ خود کو سزا دینا چھوڑ دیں..... لیکن کسی سے اتنی محبت نہیں کرنی چاہئے کہ اس کی عزت اور آبرو کے بدلے رسوائی حاصل کرنی پڑ جائے۔ محبت کو اپنی عزت سمجھنا اس کی اولین شرط ہے۔“ وہ بھگیٹی آواز میں بولی تو اس نے شرمندگی سے کہا۔

”جانتا ہوں سب جانتا ہوں لیکن میں بے بس ہو گیا تھا کیا کرتا میں..... میں اندھا ہو گیا تھا تمہاری محبت میں۔“

”اور پھر مجھے ابھی اندھا کر دیا اپنی محبت میں۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”ٹا! میری جان!“ وہ خوشی سے ہانپیں پھیلانے اس کی جانب بڑھا تو وہ بھی تڑپ کر اس کی پناہوں میں آسائی۔

کل اس نے جو بھی کیا تھا آج وہ اس کے لئے خوشیوں اور محبتوں کا محور تھا۔ اس کی سب سے مضبوط، محفوظ اور محبت بھری پناہ گاہ تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں گم مٹھوٹ مٹھوٹ کر رو دیئے تھے۔ جب من کا سارا میل ڈھل گیا تو محبتوں کا چاند من کے افق پر پوری آب و تاب سے چمکنے لگا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کے آنسو صاف کئے۔ ٹا اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”آج کے بعد آپ نہیں روئیں گے۔ ہم نئے سال کا آغاز نئے اعتماد اور اعتبار کے ساتھ کریں گے۔ اب اُشکوں کا بادل ہماری آنکھوں میں نہیں چھائے گا۔ آپ میرے لئے اب بھی وہیں انہیں ہیں جو اس اعترافِ جرم سے پہلے تھے۔ آپ کی محبتوں نے آپ کے اس گناہ کو بھی دھو دیا ہے۔ آپ میرے لئے بہت پیارے، اُبلے اور اچھے انسان ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ آپ کو

نگاہ نہ کھکا کر نہیں بلکہ نگاہ اٹھا کر ہمیشہ میرے سامنے رہتا ہے۔ میرے ساتھ میرے پاس..... لیکن یہ بھی سن لیجئے کہ اگر آپ کی محبتوں میں ذرا سی بھی کمی محسوس ہوئی تو میں آپ سے خفا ہو جاؤں گی۔“

”اوں ہوں میں اپنی زندگی کو کبھی خفا ہونے نہیں دوں گا میری محبتیں ہمیشہ تم پر سایہ کلن رہیں گی۔ ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔ میں محبت اور تم۔“ وہ اس کو اپنی بانہوں کے حصار میں لئے خوشی سے کانپتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”انشاء اللہ!“ وہ خوشی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”تھینک یو جان! تم بہت عظیم ہو آج تم نے میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے اب میں تمہیں عید اور نئے سال کے تحفے دوں گا بہت محبت سے۔“ انہیں نے محبت پاش لہجے میں کہا وہ مسکرائے مٹی۔

نئے دن کا سورج طلوع ہو رہا تھا ان کی محبتوں اور رفاقتوں کے نئے سال کا آغاز نئے اور انوکھے انداز میں ہو رہا تھا۔

